اُردو نثر کی داستان

قسط ۱۳

ہر ماہ کی یکم تاریخ کو

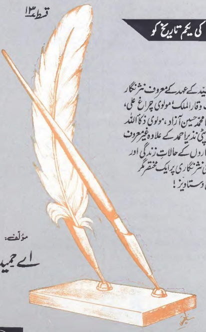

سرسید کے عہد کے معروف نثر نگار نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکا اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کے علاوہ غیر معروف نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی اور اُن کی نثر نگاری پر ایک مختصر مگر جامع دستاویز!

مؤلف:

اے حمید

۱۳

روشن کتابیں

مطبوعات شیخ غلام علی، ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

اُردو ادب کے شائقین کے لیے روشن کتابوں کی
ایک خصوصی پیش کش

اُردو نثر کی داستان قسط ۱۳

سر سیّد کے عہد کے غیر معروف نثر نگاروں سے
لے کر نواب وقار الملک ، مولوی چراغ علی ، مولوی
محمد حسین آزاد ، مولوی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد تک

مؤلف
اے حمید

مؤلف
یسد

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ ، چوک انارکلی ، لاہور

دُنیا کی ہر قومی اور علاقائی
زبان کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مُدیر مسئول : ارشد نیاز
مُدیر : رب نواز ملک

مجلسِ مشاورت :
اے حمید - ایم - ایس ناز
محمد حنیف شاہد - اشتیاق احمد

آرٹ : سلیم اختر

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پبلشرز، لاہور

ادارہ :
مطبوعات شیخ غلام علی
اُدبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور
فون نمبر :
۵۲۹۰۸ ۶۱۸۵۹ ۴۱۳۰۲۰

تار :
کتاب مین (KITABMAN) لاہور

سرسیّد کے عہد کے معروف اور غیر معروف نثر نگار

"اُردو نثر کی داستان" کی تیرھویں قسط حاضر ہے۔ اس قسط میں جہاں آپ غیر معروف نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی، ان کی اَدبی خدمات اور نثر نگاری کے بارے میں پڑھیں گے، وہاں ان کے دَور کے معروف و مشہور قلم کاروں کا تذکرہ بھی مفصّل ملے گا۔

غیر معروف نثر نگاروں میں سید محمد میر لکھنوی، یوسف خان کمبل پوش، شاہ محمد قاسم دانا پوری، مفتی اکرام اللہ صدیقی، حکیم قطب الدین باطنؔ، نیاز علی پریشاںؔ، مُنشی دیبی پرشاد، سحرؔ بدایونی، مولوی محمد رضا لکھنوی، مولوی محمد علی تحصیل دار، پنڈت گرراج کشور دت وغیرہ کے حالات زیرِ بحث آئے ہیں اور معروف نثر نگاروں میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی محمد حسین آزادؔ، مولوی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد شامل ہیں۔

جناب اے حمید نے ان نثر نگاروں کے اَدبی اَور تاریخی پہلوؤں کو ہی جلا نہیں بخشی، ان کی نجی زندگی پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

اور اس طرح زیرِ نظر کتاب اس سلسلے کی ایک خوبصورت اور خصوصی دستاویز بن کر رہ گئی ہے جس سے اہلِ ذوق اور اہلِ ادب ہی نہیں؛ طالب علم حضرات بھی مستفیض ہوں گے جیسا کہ اس سے پہلے پیش کی جانے والی اقساط سے ثابت ہو چکا ہے۔

ہمیں یقین واثق ہے کہ یہ دستاویز ہر لحاظ سے آپ کی توقعات پر پوری اُترے گی اور یہ کارواں اسی طرح رواں دواں رہے گا۔

اس کتاب کے ساتھ ساتھ ہم سلیم اختر صاحب کی کتاب "عورت جنس کے آئینے میں" پیش کر رہے ہیں جسے بجا طور پر آج کے گمبھیر معاشرے کی اہم ضرورت قرار دیا جا سکتا ہے۔ قارئین اس کتاب سے بھرپور فائدہ اُٹھائیں گے۔

نیاز احمد

سرسیدؔ کے عہد کے غیر معروف نثر نگار

سرسید کے عہد میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر تک بعض ایسے باکمال اہلِ علم اور مصنف ہو گزرے ہیں کہ ان کی تخلیقات آج ہمارے اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان میں سے بعض مصنفین کی کتابیں تو اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک انوکھا اور منفرد مقام رکھتی ہیں، اور اس موضوع مخصوص پر ان سے بہتر کتابیں نہیں ملتیں۔ ذیل میں ہم سرسید کے زمانے کے کچھ ایسے ہی بعض باکمال لیکن غیر معروف مصنفوں کا حال درج کرتے ہیں۔

سید محمد میر لکھنوی سید محمد میر لکھنوی کے بارے میں تذکرہ نگاروں کو زیادہ کوائف کا علم نہیں ہو سکا۔ داستان تاریخ اردو کے مولف حامد حسن قادری صاحب کی ریسرچ کے مطابق ۱۸۳۹ء میں ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ چھپا تھا جس کے سرورق پر یہ عبارت درج تھی۔

تاریخ راسلس شہزادۂ حبش کی جس کو عالم متبحر جانسن صاحب (سمویل جانسن ایل ایل ڈی) نے تصنیف کیا۔ سید محمد میر لکھنوی نے آگرہ سکول بک سوسائٹی کے واسطے اردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور پادری جیمس مور صاحب نے منشی محمد فتح اللہ خاں اکبر آبادی کی استعانت سے تصحیح کر کے گریں وے صاحب کے چھاپے خانے میں چھپوایا۔ ۱۸۳۹ء آگرہ"۔

دیباچہ اس کتاب کا اختصار کے ساتھ یوں ہے۔

"عاصی کمال الدین حیدر عرف محمد میر حسنی الحسینی نے واسطے صاحبان عالی شان آگرہ سکول بک سوسائٹی کے تاریخ راسلس شہزادے کی کہ جسے ڈاکٹر جانسن صاحب نے بہ کمال فصاحت اور بلاغت تحریر کیا ہے۔ اور صاحبان عالی شان بھی اس رسالے کو بہت عزیز رکھتے ہیں زبان اردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبان فہم و فراست کو تہذیب اخلاق بخوبی دریافت ہو"

اس کتاب کے ترجمے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ یہ ترجمہ بڑا صاف، شستہ اور سادہ زبان اردو میں ہے

"شہزادی نے جواب دیا کہ میں نے بہت مجرد لوگوں سے ملاقات کی جو اسی ہی سبب سے بغیر شادی کے اپنی زندگی کو عالم تجرید میں بسر کرتے ہیں لیکن کبھی نہ دیکھا کہ ان کی تمیز و فراست اور لوگوں کے حسد کرنے کے لائق ہو۔ ان کی زندگی بغیر دوستی و محبت کے مثل خواب کے گزرتی ہے۔ ہر ایک روز ان کو بے فائدہ اور بے خطر معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ بیکار اور بے شغل، بے یار و یاور پڑے رہتے اور خستگی دل سے رہائی کے لیے بیہودہ شغلوں اور خطاؤں میں مشغول ہوتے ہیں۔ ان کے چلن ان شخصوں کے موافق ہیں جو اپنے تئیں پست رتبوں میں جانتے ہیں۔ اسی سبب سے دل حسد اور بغض سے بھر جاتے ہیں اور زبان پر لوگوں کی غیبت اور عیب جوئی جاری رہتی ہے۔ گھر میں بد مزاج رہتے ہیں اور باہر بدباطن جیسے چور و قزاق جو شرع سے باہر ہو کر یہی چاہتے ہیں کہ صحبت انسانی کو برہم کریں، اس رشک سے کہ اس کی منفعت سے آپ محروم رہتے ہیں۔

یوسف خان کمبل پوش یوسف خان کمبل پوش ایک درویش سیاح کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کا اصل وطن حیدر آباد دکن بتایا جاتا ہے بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں سیر و سیاحت کا شوق بدرجہ اتم پایا جاتا تھا چنانچہ جب ذرا ہوش سنبھالی تو گھر چھوڑ کر دنیا کی سیر و سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے سب سے پہلے سارے ہندوستان کی خاک چھانی، بنگال سے مہاراشٹر اور دکن سے شمالی پنجاب سے لے کر دور دراز ترچناپلی کے جنگلوں تک کو کھنگال ڈالا۔ یہاں کی سیر و تفریح سے جی نہ بھرا تو مصر کے سفر کو چل پڑے۔ ارض فراعنہ کے کوچہ و بازار و صحرا و جبال کی دشت نوردی کی، یہاں سے نکلے تو ایک بادبانی جہاز پر سوار ہو کر یورپ کی طرف نکل کھڑے ہوئے اس اعتبار سے ہم اگر یہ کہیں کہ وہ ہمارے اردو ادب کے سب سے پہلے سیاح تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک بڑی اچھی بات انہوں نے یہ کی کہ سفر کے دوران اپنی یادداشت یعنی سفر کے حالات و کوائف کو ایک ڈائری کی شکل میں رقم کرتے چلے گئے۔

یہ ۱۸۳۷ء کی بات ہے۔ یہ زمانہ ان کے سفر ولایت اور سیاحت یورپ کا زمانہ تھا۔ ۱۸۳۸ء میں وہ یورپ سے واپس ہندوستان آئے اور یہاں اپنے سفرنامے کو دہلی میں چھپایا۔ اس سفرنامے کا نام عجائبات فرنگ رکھا گیا۔ عجائبات فرنگ اردو میں سب سے پہلا سفرنامہ کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ہمیں اردو میں سفرنامے کا سراغ نہیں ملتا۔ اسے ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور نے دوبارہ شائع کیا۔ یوسف خان کمبل پوش اس عہد کے پہلے اردو نثر نگار تھے جنہوں نے ولایت کا سفر کیا۔ سرسید، راجہ موہن رائے اور مولوی مسیح الدین وغیرہ اس کے بعد سیاحت پر گئے۔ یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامے کی سب سے نمایاں خصوصیت بھی یہی ہے کہ یہ ایک ایسے مصنف کا سفرنامہ ہے جو محض سیاحت کے لیے سیاحت پر نکلا جس کا مقصد اس سفر سے محض سیر و تفریح حاصل کرنا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ سرسید کی طرح یا دوسرے مصنفین کی طرح ولایت کسی اہم مقصد سے گئے اور سفرنامہ بھی ساتھ ساتھ لکھتے چلے گئے۔ یوسف خان کمبل پوش اوّل سے آخر تک ایک سیاح تھا اور اس کی کتاب بھی ایک سفرنامہ ہے اور اس کے مصنف کی سوائے سفر کرنے کے اور کوئی ملکی یا علمی غرض نہ تھی۔

یوسف خان کمبل پوش ۱۸۳۷ء میں انگلستان روانہ ہوئے اور ۱۸۳۹ء میں واپس کلکتہ آئے تھے اس سفرنامے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ کمبل پوش نے تاریخ اور سن ساتھ ساتھ لکھے ہیں ہوٹلوں اور لندن شہر کے گلی کوچوں کے نام اور نمبر تک صحیح صحیح درج کیے ہیں۔ یوسف خان کمبل پوش اس سفرنامے میں اپنا مذہب "سلیمانی" ظاہر کرتے ہیں یعنی ایک ایسا مذہب جس کے ماننے والوں کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت سے ہو۔ یوسف خان کمبل پوش شراب کے رسیا تھے اور اپنی کتاب میں اس کا جا بجا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی۔ عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تم مذہب مسلمانی رکھتے ہو، شراب کیوں پیتے ہو۔ جواب دیا کہ حضرت پیغمبر نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔"

یوسف خان کمبل پوش نے کتاب میں اہل فرنگ کے آداب و اخلاق اور تہذیب کی بہت توصیف لکھی ہے۔ دوران سفر میں گو انہیں مشکلات کا سامنا بھی ہوا، اور اہل فرنگ نے ان کی جو مشکلات میں مدد کی اس کی بھی بڑی تعریف کی ہے۔ یوسف خان کمبل پوش نے انگریز خواتین کے ساتھ اپنے معاشقوں کا حال بھی بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ عشق و محبت محض نفسانی خواہشات کے واسطے تھی۔ یورپ میں جنسی بے راہ روی کا حال بھی بڑا کھل کر بیان کیا ہے۔ یوں یہ سفرنامہ بڑا اکمل اور فنی اعتبار سے کامل سفرنامہ ہے۔ زبان میں وہی انداز ہے جو آج سے سو برس پہلے رائج تھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"یہ فقیر سن اٹھارہ سو اٹھائیس عیسوی مطابق سن بارہ سو چوالیس ہجری کے حیدر آباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مدراس، گورکھ پور، نیپال، اکبر آباد، شاہجہان آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا یہاں بمددگاری نصیب اور یاوری کپتان ممتاز خان ہکس صاحب بہادر کے ملازمت نصیر الدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں تاب بیان اور یارائے گویائی۔ رسالہ خاص سلیمانی میں عہدہ جمعداری کا دیا۔ بعد چند روز کے صوبہ داری اسی رسالے کی دے کر رتبہ بڑھایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا اور شکرانہ منعم حقیقی کا بجا لاتا۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامنگیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا بعد اس کے بیشتر کتابوں تاریخ کی سیر

کستا دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا اک بارگی ۱۸۳۶ء عیسوی میں دل میں مطلب گار سیاحی جہاں بالخصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے ظاہر کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بعد عنایت و اکرام اجازت دے دی، عاجز تسلیمات بجا لایا۔ اور راہی منزل مقصود ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد وارد کلکتہ پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی جہاز پر سوار ہو کر بہ سمت بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا لانڈ ایلیڈ، کپتان کا ڈیڈ بران صاحب مع اپنی بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سو ٹن کا کنارے پہ لگا تھا۔"

فرانس کے شہر پیرس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پندرھویں دن ایک مکان میں گیا۔ وہاں صدہا آدمی غالیچے شطرنجیاں بُن رہے تھے بناوٹ میں تصویر کھینچتے۔ دریافت ہوا کہ وہ سب مصور تھے۔ تصویریں، قالین اور دریوں پر ایسی معلوم ہوتیں کہ کسی کامل نے تصویریں کاغذ پر کھینچی ہیں۔ ان کی کاریگری دیکھ کر متحیر ہوا۔ حال ان کا پوچھا۔ ظاہر ہوا کہ واسطے فرش و دیوان عام شاہ فرانسیس کے بنتے ہیں اور کہیں نہیں فروخت کرتے۔ زبان فرانسیسی میں اس کام کو ٹیپسٹری کہتے ہیں۔ اس کے بعد کونسل کے مقام پر گیا۔ ایک مقام ٹھیک بنا، دو میا ستون سنگ مرمر کے ایک ڈال راست اس میں لگے صاحبان کونسل اپنے رتبے کے مطابق جا بجا بیٹھے، ہر ایک کے نمبر لکھے۔ اس مکان کی شکست و ریخت کے لئے مزدور لگے تھے۔ میں حال دیکھ کر باہر نکلا، پانی برسنے لگا، سارے کپڑے تر ہو گئے۔ مر گرتے پڑتے گھر چلے۔ راہ میں دو رنڈیاں ایک خوبصورت دوسری کریہہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ٹک ٹک کہتی تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آئیں۔ ایک کا پاؤں پھسلا، دونوں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زن حسینہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ بدشکل کو ویسے ہی چھوڑا۔ وہ بڑی محبت سے اٹھ کر اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی، مگر اس زبان سے مجھ کو آگہی نہ تھی۔ آخر اس نے ایک دھکا دیا مجھ کو زمین پر گرا دیا۔ دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے اٹھایا تھا، میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچا کر غنیمت سمجھا۔ وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے میرے پیچھے دوڑتے آتے۔ بہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پہنچا۔ میرا حال دیکھ کر ہم راہی ہنسنے لگے۔ میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔ پاؤں میں چوٹ آئی تھی۔ اس سبب سے دو ایک دن قیام کیا۔"

شاہ محمد قاسم داناپوری

پورا نام سید شاہ محمد قاسم ابوالعلائیؒ ابن سید تراب الحق تھا۔ داناپور میں ان کا خاندان تصوف اور علم دوستی کی وجہ سے بہت مقام رکھتا تھا اور اس کا سلسلہ ابوالعلائیہ تھا۔ شاہ محمد قاسم داناپوری اس سلسلے کے سجادہ نشین تھے مگر وہ خود کام کر کے روزی کمانا چاہتے تھے۔ چنانچہ الہ آباد کی کچہری میں ملازمت کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد الہ آباد سے آگرہ چلے گئے۔ آپ آگرے کے صدر نظامت میں مسل خوان کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ آپ کے مزاج میں توحید پرستی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ اور طبیعت خدا کی محبت کی طرف مائل تھی۔ لیکن اپنی کیفیات کو چھپائے رکھتے تھے۔ لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ کسی انگریز حاکم کے سامنے ایک مسل کو با آواز بلند پڑھ رہے تھے کہ مقدمے کے واقعات نے ان کے دل پر گہرا اثر کر دیا اور حالت جذب طاری ہو گئی۔ "اللہ" کا زوردار نعرہ لگایا اور مسل پھینک کر چلے گئے۔ کئی روز تک آگرے کے گرد و نواح میں پھرتے رہے مگر وہ انگریز حاکم شاہ محمد قاسم کو ایک اچھا انسان سمجھتا تھا اور ان سے بہت خوش تھا چنانچہ اس نے اس واقعے سے ان کے خلاف کوئی اثر نہ لیا اور شاہ محمد قاسم کو بلوا کر انہیں پھر سے ڈیوٹی پر مامور کر دیا۔ ہاں اس نے دفتر والوں سے کہہ دیا کہ انہیں آگے سے کوئی "اللہ والی" مسل نہ دی جائے۔

صدر نظامت آگرہ میں اکثر مسلمان حاکم اور وکیل ہوتے تھے۔ ان میں مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی وکیل صدر تھے۔ شاہ محمد قاسم کے ساتھ ان کو ایک تعلق خاص تھا اور ان کے دوست بن گئے تھے۔ ان کے علاوہ نظامت آگرہ ہی کے دفتر میں مولوی غلام امام شہید اور مولوی کریم اللہ خان صدر جج بھی تھے۔ ان سب کی محفل انعام اللہ خاں بہادر کی کوٹھی پر لگتی تھی۔ اسی زمانے کا ایک قصہ ہے کہ میسور کے نواب کے برادر زادہ سید شاہ احمد علی قادری عرف ضیاء الدین ولاور جنگ کو جہاد کا شوق ہوا اور میسور سے چل کر آگرہ آ گئے۔ یہ مفتی انعام اللہ صاحب کے گھر پر ہی اترے اور ان ہی کے مہمان ہوئے۔ یہاں پر آگرہ کے اہل علم کی مجلس لگتی تھی۔ اور شہر کے رئیس بھی جمع رہتے تھے۔ ان سب حضرات نے سید احمد علی صاحب کے جذبۂ جہاد کو بہت سراہا اور ان کی امداد بھی کی۔ چنانچہ سید میسوری اپنے احباب کے ساتھ آگرے سے چل کر شاہجہان پور کی طرف آ گئے۔ یہاں شاہجہان پور کے پوربیوں سے مقابلہ ہوا اور سید میسوری نے جام شہادت نوش کیا۔

اس واقعہ کے بیس برس پہلے یعنی ۱۸۲۵ء میں مولوی سید احمد بریلوی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی سکھوں سے جہاد کا معرکہ مار چکے تھے، اور "ترغیب جہاد" وغیرہ کتابیں ضبط تحریر میں آ چکی تھیں۔ سید میسوری کے واقعہ شہادت اور تحریک جہاد کی وجہ سے انگریز حاکم مولوی انعام اللہ خاں کے ساتھیوں سے ناراض ہو گئے اور ان پر رشوت ستانی کا ایک بے بنیاد مقدمہ کھڑا کر دیا۔ لیکن چونکہ مقدمے کا ثبوت کوئی نہیں تھا اس لئے یہ تمام اصحاب بری کر دیئے گئے۔ یہ ہنگامہ "ولسن گردی" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس ولسن گردی میں اور اس مقدمے کی سماعت جج ولسن نے مراد آباد میں کی۔ شاہ محمد قاسم بھی دوسرے مسلمان وکلا کے ساتھ ملازمت چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔

شاہ محمد قاسم نے ایک کتاب "اسرار قاسمی" اور دوسری "اعجاز غوثیہ" فارسی زبان میں لکھی۔ پہلی کتاب یعنی "اسرار قاسمی" کا اردو میں ترجمہ مفتی انعام اللہ نے کیا ہے۔ شاہ صاحب کی اردو کی تصنیف "نجات قاسم" ہے۔ اس کتاب یعنی "نجات قاسم" میں حضرت سید امیر ابوالعلا کے حالات و کرامات درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۶۱ھ میں نینی تال کے مقام پر لکھی گئی۔ اسے ۱۲۶۳ھ میں ہی آگرہ کے مطبع اشرف الاخبار نے چھاپا۔

نمونۂ "نجات قاسم" ملاحظہ ہو۔

> "یہ کاتب گنہگار جب پہلے پہل شہر اکبرآباد میں حاضر ہوا ہے تو سال بارہ سو اکسٹھ ہجری تھا۔ جس وقت روضۂ منورہ پر حاضر ہو کر بعد قدم بوسی اور فاتحہ کے آنکھیں بند کر کے پائیں مزار شریف کے بیٹھا تھا۔ کانوں میں یہ آواز آئی کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت کے انتقال کے پورے دو سو برس کے بعد تو زیارت سے مزار انور کے مشرف ہوا۔"

اس کتاب میں سے ایک اور اقتباس پیش خدمت ہے۔

> "جس روز یہ کاتب عاصی صدر دیوانی کی کچہری کے ساتھ بلدہ خیر کہ اکبرآباد میں پہنچا اس کی صبح کو مکان فرود گاہ سے بہ تمنائے زیارت روضۂ منورہ اپنے پیشوا حضرت امیر ابوالعلا قدس اللہ سرہٗ کے چلا۔ مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے محلوں اور سواد شہر سے نابلد تھا، اور جو آدمی ہمراہ تھے وہ بھی بالکل ناواقف تھے، گو وہ تردد ہوا۔ پھر یہ خیال کیا کہ شہر سے باہر نکل کر کسو سے راستہ درگاہ شریف کا پوچھ لیں گے۔ جب چار سو دروازہ سے آگے بڑھا ہنوز نوبت پوچھنے کی کسو سے نہ پہنچی تھی کہ دو لڑکے نہ معلوم کدھر سے آ کے میری پالکی کے ساتھ ہو لیے اور خود بخود پوچھنے لگے کہ تم ابوالالا کی درگاہ پر جاؤ گے؟ واضح ہو کہ شہر اکبرآباد کے بازاری لوگ اور سب لڑکے ہمارے حضرت کو ابوالالا کہتے ہیں اور یہ لفظ ان کی زبان سے اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ لطف اس کا تحریر میں نہیں آ سکتا۔"

اپنے پیشوا حضرت امیر ابوالعلا کے حالات یوں درج ہیں۔

"جاننا چاہیئے کہ جب حضرت خواجہ فیضی قدس سرہ کسو لڑائی میں شہید ہوگئے۔ تب راجہ مان سنگھ نے اس عہدہ نظامت پر برادران کے جناب حضرت امیر ابو العلا قدس سرہ کو مقرر کر کے منصب سہ ہزاری ذات اور سہ ہزاری سوار کا بادشاہ کے حضور سے دلوایا۔ آپ کے پاس اسباب تجمل اور شوکت کا از قسم ہاتھی گھوڑے اور اونٹ اور رتھ وغیرہ سامان امرائی بہت تھا چنانچہ نقل ہے کہ بعد ترک دنیا اور جلوہ افروزی مسند فقر و درویشی کے بھی یہ حال تھا کہ جب کبھی آپ شکار کو تشریف لے جاتے تو بیالیس نفر مرت بازدار رہم رکاب فیض انتساب کے ہوتے تھے۔ اور سامان کو اس پر قیاس کرنا چاہیئے۔ الغرض راجہ مان سنگھ باوصف ایسے احتشام ظاہری کے کہ تمام قلمرو بنگالہ کا مالک اور حاکم تھا، حضرت کی اس قدر تعظیم اور تکریم کرتا تھا کہ اپنی مجلس میں جمیع امرا بلکہ اپنے فرزندوں سے بھی بالاتر جگہ آپ کو دیتا تھا۔"

مفتی اکرام اللہ صدیقی

مفتی اکرام اللہ صدیقی ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے ہے ان کے والد کا نام مفتی انعام اللہ خان صدیقی گوپاموی تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے عالم فاضل باپ ہی سے حاصل کی۔ بڑے ہو کر اس زمانے کے دوسرے اہل علم سے بھی فیض حاصل کیا۔ علم طب ڈاکٹر سکندر لال اکبرآبادی سے پڑھا۔ اس کے بعد انہوں نے مختاری کا امتحان دیا اور پاس ہوئے۔ بعد ازاں الہ آباد آگئے جہاں وہ مختار مقرر ہوئے تصنیف و تالیف کا شوق انہیں بے حد تھا اور کئی ایک فارسی اور اردو کی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ جن میں اخبار واصلین۔ تذکرہ مصنفین، مفید الطالب۔ علمائے اودھ، قواعد اردو اور فارسی جدید وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان سب میں ان کی کتاب تصویر شعرا بڑی نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ آگرہ اس زمانے میں شعر و شاعری کا مرکز تھا۔ باہر سے اکثر شعرا وہاں آتے اور اپنا کلام لوگوں کو پڑھ کر سناتے تھے۔ مشہور سخن پرور شخصیت بابو بینی پرشاد وکیل کے مکان پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں بابو بینی پرشاد وکیل کے مکان پر جو مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا کے مکمل حالات اور ان کا کلام اس کتاب تصویر شعرا میں درج کیا۔ یہ کتاب مرزا علی حسین نیر کے مطبع حیدری سے ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔

تمہید میں مفتی اکرام اللہ صدیقی لکھتے ہیں۔

"بشنو از انصاف اگر متقلی — شعر بود حجت روشن دل
در شرف شعر رسولؐ خدا — گفت بے قول بمدح و ثنا
شعر کہ اصحاب نبیؐ گفتہ اند — چوں دُر و یاقوت دگہر سفتہ اند
شعر علیؓ گفت حسینؓ و حسنؓ — کعب رضؓ داشتؓ گفت واویسؓ قرن
شعر کہ حسانؓ عرب گفتہ است — سید کونین پذیرفتہ است
منع ز اشعار نکردش نبیؐ — تائب ازاں کار نکردش نبیؐ
بلکہ بپاداکرو مزد آفرین — سید کونین رسولؐ امیں

سخنوران معنی آفریں پر واضح اور آشکار ہے کہ سخن کی قدر افزائی کے لئے طبع سلیم اور ذہن مستقیم درکار ہے۔ سخنور کو ہمیشہ سخنداں کی جستجو ہے، کس واسطے کہ گوہر کی جوہر شناسی سے قدر اور آبرو ہے۔

ز سید ہیچ کمالے بہ سخن سنجیدن — کہ سخن را صلہ نیست بجز فہمیدن

جو لوگ اس قاعدے کو نہیں مانتے ہیں، وہ آپ اپنی قدر نہیں جانتے ہیں۔ بے شک سخن کی تحسین کے لئے مخاطب سخن فہم درکار ہے۔ اپنی ستائش اپنی زبان سے کب سزاوار ہے۔ شاعر جب تک سخن فہم سے داد نہ پائے گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو کہنے سے سخن گو نہ ہو جائے گا۔ بیت

طوطی زمعنی سخن خویش غافل است — ہرکس سخنور است سخنداں نمی شود

اس نظر سے شعرائے فخر البلاد اکبرآباد کو اہل جوہر جوہر شناس کی جستجو اور سخنور سخن فہم کی آرزو رہتی ہے۔ الحمد للہ کہ دعائے باطنی نے دعائے دلی کی صورت دکھائی اور بعد عرصہ دراز کے مرادان کی باحسن وجوہ برآئی کہ جن دنوں یہ حسن اتفاق جناب برگزیدہ آفاق جوہر آئینہ کمال، صورت گر حسن و جمال معنی آفریں نازک خیال، نکتہ سنج عدیم المثال، استاد یکتا امام الشعرا فاضل وحید حضرت مولانا غلام امام شہید مدظلہم اور سخنور شیریں مقال، معنی سنج نازک خیال برادر گرامی قدر منشی غلام غوث صاحب بے خبر میر منشی نواب مستطاب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اس شہر میں رونق افروز ہوئے۔ ہر طرف مقدم سعید سے عید ہوگئی۔ خاص و عام فیض یاب اور مسرت اندوز ہوئے۔ معنی پردازان سخنور نے موقع غنیمت سمجھ کر اس بات کا ارادہ کیا کہ کلام ہدگر سے چاشنی گیر مذاق ہوں، اور جوہر طبع آزمائی دکھائیں۔ یہ بات سنتے ہی انجمن آرائے سخن و معانی، رموز شناس اسرار سخندانی جواہر شناس صاحب جوہر، نوباوہ گلشن مراد بابو بینی پرشاد صاحب عالی قدر وکیل عدالت صدر زاد حشمتہ نے اپنے دولت خانہ فیض کاشانہ کو فروش منقش، اور مسند اور کنول جھاڑ مردنگیاں دیوارگیر فانوس اور مرآت حیرت افزا سے جیسے دیکھ کر آفتاب و مہتاب پھڑک جاوے اور پردہ ہائے رنگا رنگ گل ہائے بوقلموں عطریات گوناگوں سے جس کی خوشبو سے چمن زار بہشت مہک جاوے پیراستہ کر کے صلائے عام دی، اور ارباب ذوق و شوق کو خبر کی کہ نکتہ وران صبح نفس اور سخن سنجان دقیقہ رس تشریف لاویں، ہم کو ممنون منت فرماویں، بس تمام شہر میں اس مشاعرہ کی شہرت ہوئی عجب طرح کی رنگین صحبت ہوئی۔۔۔ یہ مجموعہ اس مجمع کا جامع کلام ہے۔ تصویر شعرا اس کا تاریخی نام ہے۔"

اس کتاب میں اس مجلس میں شریک شعرا کا نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے۔ کچھ شاعروں نے بابو بینی پرشاد کی تعریف میں شعر پڑھے تھے۔ ان میں سے مرزا عباس بلیغ اکبرآبادی کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

بابو کا ہے دل حب علیؓ سے آباد — ہے دوستی علیؓ سے ہر دم دل شاد
اس دوستی علیؓ کے گن لو اعداد — ہے ہم عدد اس سے بابو بینی پرشاد"
۵۹۰

بہ طرحی غزلیات کا انتخاب دیا جاتا ہے۔

باطن — حکیم سید قطب الدین اکبرآبادی

رازداران حقیقت کے لبوں پر ہے مہر
خود خبردار ہیں وہ کس کو خبر دیتے ہیں

اسیر — میر گلزار علی خلف و جانشین میاں نظیر اکبرآبادی

ساقیا ہوش میں آ، ظرف کو دیکھ آنکھیں کھول
ان تنگ ظرفوں کو اتنا نہیں بھر دیتے ہیں
آنکھ ابھی سر محفل نہیں ملتے ساقی
دیکھتے ہیں وہ کدھر جام کدھر دیتے ہیں

بہادر — بابو رن بہادر سنگھ

اے مسیحا ترے بیمار شب ہجراں کو
جام خورشید میں تبرید سحر دیتے ہیں
دل بھر آتا ہے اب خیر نہیں عالم کی
آج طوفان کی خبر دیدۂ تر دیتے ہیں

راجہ — مہاراجہ طوان سنگھ بہادر راجہ کاشی۔

ع یار کے حسن پُر آشوب کی ہے دل میں جگہ
یہ وہ دریا ہے، جسے کوزے میں بھر دیتے ہیں
ساجد یہ شوقِ اسیری ہے کہ مرغانِ قفس
اپنے منقار سے پر اپنے کتر دیتے ہیں

صفیرؔ — لالہ گنگا سہائے

ع اٹھ گئے ہجر کی شب وصل کے دشمن میرے
آج آواز نہیں مرغ سحر دیتے ہیں

مہرؔ — میرزا حاتم علی بیگ مہر شاگرد ناسخ

ع یہ نئی طرز مسیحائی ہے سبحان اللہ
جان آجاتی ہے، وہ دم بھی اگر دیتے ہیں
ہم تو اللہ کو بھی یوں نہیں کرتے سجدہ
اے صنم سر کو ترے پاؤں پہ دھر دیتے ہیں

حکیم قطب الدین باطن

پورا نام حکیم قطب الدین۔ باطن تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۱۵ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حکیم میر محمدی ظاہر تھا۔ وہ بھی شعر و شاعری سے بہت شغف رکھتے تھے اور ظاہر تخلص کرتے تھے۔ حکیم صاحب کا مکان قدیم محلہ تاج گنج آگرہ شہر میں تھا۔ ان کے آبا و اجداد شاہی حکما میں شمار کئے جاتے تھے۔ حکیم صاحب نے ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم نظیر اکبر آبادی سے حاصل کی تھی۔ بعد ازاں شعر کہنے شروع کئے تو نظیر اکبر آبادی کے سامنے ہی زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ حکیم صاحب کے مرشد کا نام نامی حضرت سید غلام نصیر الدین دہلوی عرف میاں کالے تھا۔

ع ہر دم نام میاں کالے (مومن)

حکیم قطب الدین باطن کے چار دیوان ہیں۔ ان میں ایک مثنوی بھی ہے۔ یہ مثنوی ساری مثنوی میر حسن کا خمسہ ہے۔ اس کا نام اعجاز رقم ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۹۲ء میں انعام اللہ خاں کے زیر اہتمام مطبع ریاض ہند آگرہ میں چھپی بڑی تقطیع کے ۱۵۰ صفحے ہیں۔ مثنوی میر حسن میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے۔ حکیم باطن نے ہر شعر کا خمسہ کیا ہے۔ بقول حامد حسن قادری صاحب مسلسل داستان کو اس طرح تضمین کرنا کہ تضمین بھی اصل مثنوی کی طرح مسلسل و مربوط داستان بن جائے، نہایت مشکل کام ہے۔ باطن کی تضمین میں بھی ہر جگہ تسلسل نہیں رہا، صرف ایک شعر کی تضمین ہو گئی ہے۔ اوپر نیچے سے سلسلہ نہیں ملا لیکن جہاں تسلسل قائم رہا ہے اور تضمین اچھی ہو گئی ہے وہاں حکیم باطن کا کمال نظر آتا ہے۔ مثنوی کے سب سے پہلے شعر کی تضمین یہ ہے۔

پے فکر بیٹھا ہوں میں سر بجیم   مہیا ہے سامان سب بیش و کم   لکھوں پیچھے نعت رسول اہم
کروں پہلے توحید یزداں رقم   جھکا جس کے سجدے کو اوّل قلم

حمد کے ایک شعر کے مشکل تکیے کی تضمین ملاحظہ ہو۔

نہ اخلاق سے بڑھ کے گلشن میں گل   مچا اس کی وحدت کا ہر سمت غل   دوئی کا کہیں تو نہ کھا جائیل
چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ گل   کہ مشتاق ہیں جس کے یاں جزو و کل

اور ایک مقام پہ تضمین کی خوبی ملاحظہ ہو۔

شہان جہاں سر فرو ہیں یہیں   کسے تاب ہاں کر سکے یا نہیں   وہ عالم میں ہے احکم الحاکمیں
وہ ہے مالک الملک و دنیا و دیں   ہے قبضے میں اس کے زمان و زمیں

نعت شریف کی ایک تضمین پیش خدمت ہے۔

ہوئے یوں تو پیدا بہت مرسلیں   نے آدم سے تا عیسیٰ پاک دیں   یقین جان لو اس کو اے مومنیں
محمد کی مانند جگ میں نہیں   ہوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں

جو نورِ مجسم کوئی شے ہو اب   تو خورشید ساں سایہ افگن ہو کب   ہے تاویل طبعی سنو اس کو اب
نہ ہونے کا سایہ کے تھا یہ سبب   ہوا صرف پوشش میں کعبہ کی سب
نظر روح کا کس کو آتا ہے تن   وہ ہے امر رب تن کا مت لا سخن   سمجھ کی ہے بات اے جان من
وہ قد اس لئے تھا نہ سایہ فگن   کہ تھا کل وہ ایک معجزے کا بدن
تجلی میں ظلمت کسے ہے کام کیا   اجالا ہے خود قدرتی نور کا   قدم کے تلے پس کے کیا رہ گیا
خوشی آیا نہ سایہ کو ہونا جدا   اسی نور حق کے رہا زیر پا

ایک داستان کی تضمین کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

چھلکتا ہے عیش کا واں ایاغ   شب و روز خورشید و ماہ تھے چراغ   سدا راحت و خرمی سے فراغ
ہمیشہ خوشی رات دن سیر باغ   نہ دیکھا کسی دل پہ جز لالہ داغ
حصول ہر طرح سے تھی فرحت اسے   میسر ہر اک مال و نعمت اسے   کہاں عیش و عشرت سے فرصت اسے
سدا ماہ رویاں سے صحبت اسے   سدا جامہ زیبوں سے رغبت اسے
ندیمان ذی ہوش کا اژدہام   وزیران دانا کا تھا اہتمام   کنیزان خوش رو سے ہر لحظہ کام
ہزاروں پری پیکر اسکے غلام   کمربستہ خدمت میں حاضر مدام
خدا کی عبادت بغل میں صنم   خزف ریزہ تھا اس کے کف میں درم   میسر خوشی عیش و عشرت بہم
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم   مگر ہاں اک اولاد کا تھا الم
اسی غم سے اس کو نہ ہوتا فراغ   اسی رنج میں رہتا تھا بد دماغ   اسی فکر سے پھر رہا تھا ایاغ
اسی بات کا اس کے دل پر تھا داغ   نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ

حکیم باطن نے نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے گلشن بے خار کے جواب میں تذکرہ گلستان بے خزاں لکھی۔ یہ کتاب نثر میں ہے۔ اس کتاب کے بارے میں حکیم باطن اپنے تذکرہ تاریخ میں لکھتے ہیں۔

ع خامہ نے جب دیا جواب سوال   روبرو رکھ کے گلشن بے خار
مصنفان زمانہ کہنے لگے   ہے گلستان بے خزاں میں بہار
بلبل فکر پھر تو اے باطن   چہچہایا یہ کھول کر منقار
نام تاریخی اس شگوفے کا   "نغمۂ عندلیب" کہہ اے یار
۱۲۶۱ھ

اس کتاب کے لکھنے کی وجہ اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ سے حکیم باطن کی مخاصمت کی اصل بنیاد یہ تھی کہ نواب شیفتہ نے اپنی کتاب گلشن بے خار میں نظیر اکبر آبادی کے بارے میں یوں لکھا تھا۔

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاری است و نظر بر آں ابیات در شمار شعرا نشاید شمرد" — یعنی میاں نظیر اکبر آبادی کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں۔ ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں ہے۔

حکیم باطن صاحب کا اس پر برافروختہ ہونا قدرتی بات تھی کیونکہ نظیر اکبر آبادی حکیم صاحب کے استاد تھے چنانچہ حکیم باطن نے اپنے تذکرے بہ الفاظ دیگر شیفتہ کے تذکرے کے جواب الجواب تذکرے میں شیفتہ اور اس کے استاد حکیم مومن خان مومن اور ان کے دوست آزردہ کو خوب رگیدا ہے۔

آزردہ نے ایک شعر میں حرکت کو بسکون را نظم کیا ہے۔ ع

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے
گر ہم بھی ٹک حرکت نا اہل سے ہوتے

اس بارے میں حکیم صاحب آزردہ کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں

"مولوی صاحب! بطراح امرکن میں مصدر ایسے افعال کا ہونا شعرائے ماضی و حال کو مجہول جاننا استقبال اپنے اسم کا معروف کرنا اپنے کلمے کو سب کے فعل سے اپنے ضمیر میں مستقبل سمجھنا، اور ضلع جدید کا فاعل ہونا۔ . . . . مضموم کو مکسور، مکسور کو مفتوح کہہ کر پیش آنا اور پھر اپنے تئیں دائرہ عقل سے خارج نہ گننا، اور ساکن کو متحرک

کو ساکن بولنا اور عالم تبحر کہلانا اور اس لحن ترانی سے ساکن نہ ہونا زبردستی سے کلام کو زیر و زبر کرنا سبحان اللہ! زبانی ذی علموں کی گوش گزار ہے کہ لفظ صحیح حرکت برقرار ہے متحرک نہ ساکن ہر شہر و ہر اماکن۔ اور مولوی صاحب با وصف علم و فضل کیا غلط لفظ فرماتے ہیں۔

با ایں فضیلت و مکرمت کیا کلمۂ لغو زبان پر لاتے ہیں
گر ہم بھی سبک حرکت نااہل سے ہوتے ——— تو تصریح ساکن اسی مصرع میں ناموزوں بتاتے

اپنے تذکرہ میں حکیم مومن خان کا حال یوں رقم کیا ہے۔

"مومن تخلص، مومن خان نام۔ ساکن شاہجہان آباد۔ شاگردان سخن کے استاد اگر فوربان سحر بیانی فکر دیکھے تو صحن خانہ سے کوچ کر جائے کشش الفاظ سے اس کے ہوش میں خرابی پائی جائے۔ رشتۂ جاں تار تار ہو۔ رشک مضمون سے ہر شاعر ہاتھ مل مل کے بے قرار ہو۔ کلام میٹھا ایسا گاڑھا کہ جس کی حیرت سے شیریں زبان شل کوہ کن کے شور مچائے۔ نشۂ شراب الفاظ سے مخموران خمخانۂ سخن و ستار کو ہوا میں اڑائیں۔"

نیاز علی پریشان

نیاز علی پریشان کے آباؤ اجداد شہر دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے اسلاف قدیم سعادت خاں برہان الملک کے ہمراہ دہلی سے ترک سکونت کر کے اودھ گئے اور سندیلہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ کچھ عرصہ بعد نیاز علی پریشان کے قریبی بزرگ سندیلہ سے آگرہ آگئے۔ چنانچہ نیاز علی پریشان آگرہ میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تربیت و تعلیم ہوئی۔ ان کے والد کا نام شیخ رجب علی تھا۔ پریشان شعر و سخن میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کے شاگرد تھے۔ انہوں نے غزلیات بھی کہیں قصیدے بھی لکھے اور مثنویاں اور واسوخت بھی لکھی ان سب میں ان کی کتاب تذکرۂ شعر و سخن سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ اس کا اسلوب بھی وہی حکیم باطن کے تذکرے والا ہے پریشان کو بھی اس کتاب کی تصنیف کا خیال آگرے میں ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو منعقدہ ایک مشاعرے کی وجہ سے آیا۔ یہ مشاعرہ عظیم الشان تھا اور اس کی پبلسٹی ملک سے باہر بھی پہنچی چنانچہ فرانسیسی مستشرق گارسان دتاسی نے اپنے ایک خطبے میں اس مشاعرے کا یوں ذکر کیا ہے۔

"ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہونے والا تھا۔ اودھ اخبار مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۹ء میں ان شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ہے جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔"

(خطبات گارسان دتاسی)

اس مشاعرے کے لئے شاعروں کو ایک سوال نامہ بھیجا گیا تھا جس کو انہیں پُر کرنا تھا۔ پریشان نے اس قسم کے سوال نامے کی غرض یہ بیان کی ہے کہ اس طریقے سے تمام شاعروں کا حال برائے تذکرہ موصول ہو جائے گا۔ یہ مشاعرہ آگرہ کے کشمیری بازار میں مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کاشی کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ پریشان نے اپنے تذکرے میں اس مشاعرے کا حال یوں بیان کیا ہے۔

"اسی شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں بعد ایک دوسرے کے بہت صفائی کے ساتھ پڑھیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر جب پڑھ چکے تو خلیفہ سید گلزار علی صاحب اسیر نے پڑھ کر لوگوں کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد جناب راجہ صاحب بہادر نے کلام دل آویز سنایا۔ آفتاب طلوع ہو گیا تھا۔ مشاعرہ برخاست ہوا۔"

اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اب سنئے کہ ایک روز جی چاہا کہ کوئی ایسا کام کیجئے جس سے نام باقی رہے۔ مگر یہ فقیر بادشاہ نہ تھا کہ رعایا پر رحم کرتا۔ غنی نہ تھا کہ محتاجوں کو مال و زر دیتا۔ زور آور نہ تھا کہ رستم کی طرح گرز اٹھاتا۔ سپاہی نہ تھا کہ تیر و شمشیر کے مار دکھاتا۔ صاحب کرامت نہ تھا کہ کشف سے کرشمے ظاہر کرتا۔ عالم نہ تھا کہ جھگڑے چکاتا۔ سخی نہ تھا کہ ایثار کرتا۔ حکیم نہ تھا کہ مسیحا ہوتا۔ شاعر تھا۔ جھوٹ سچ بکتا تھا۔ پھر کونسی صورت نام باقی رہنے کی تھی۔ غزل، رباعی، مثنوی، واسوخت، مخمس، مسدس وغیرہ کہنے والے کہہ گئے کسی نے کوئی بات اٹھا نہ رکھی مضمون آرائی نظم و نثر کی صفائی مجھ سے کب بن پڑتی بالفرض دو چار شعر مربوط کر کے تو کیا کیے۔ اس پر فخر کرنا سزا وار چھچھورا پن ہے۔ وضع میں دھبا لگتا ہے۔ سب سے قطع نظر کر کے یوں ٹھہرائی کہ ایک تذکرہ نئی طرز کا تالیف ہو تو کیا خوب ہو۔ پھر یہ بھی خیال ہوا کہ تذکرے تو بہت ہیں تمہارا کیا تم کیا تدبیر کرو گے۔ بھئی ایسا کرو کہ تذکرہ بطور مشاعرے کے مرتب ہو جس میں زمانہ حال کے سخنوروں کا کلام خواہ فارسی، خواہ اردو، ایک ہی طرح پر لکھا جاوے۔ غرض کہ نیا پہلو یہ نکالا کہ طرح طبیعت کے آزمانے کی کسوٹی ہوتی ہے۔ کھوٹا کھرا پرکھا جاتا ہے۔ قافیہ اور ردیف کی نشست، بندش اور ترکیب کی خوبی، الفاظ اور معانی کی درستی مضمون اور قادرہ کی چستی معلوم ہو جاتی ہے۔ غرض ان باتوں کو سوچ سمجھ کر استاد نامدار جناب مرزا صاحب گردوں وقار سے کہا۔ انہوں نے فرمایا ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ مگر تدبیر کرو۔ لاؤ طرح کہیں۔ شاعر پسند کریں۔ چنانچہ مصرع طرح اردو کا فرمایا۔ ع

تری دیوار کے سایہ تلے آ کر ہما ٹھہرے

دوسرا مصرعہ میرے بڑے مہربان مولوی احمد خاں صاحب تخلص صوفی نے تجویز کیا وہ یہ ہے۔

در سرم از نکہت زلف است سودائے دگر

فارسی کا مصرعہ کیا شگفتہ ہے اور اردو کا پہلودار۔ قافیہ وسیع بحر رواں۔ تمام حسن رکھتا ہے۔ ایک اشتہار میں دونوں مصرع مع ایک نقشہ مجوزہ موتف کے لکھ کر جا بجا بھیجے گئے"

یہ مشاعرہ جب آگرہ میں ہوا تو مرزا غالب کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے آٹھ مہینے ہو چکے تھے اس کتاب میں (تذکرہ) آگرہ کے مقامی شاعروں کے علاوہ باہر سے آنے ہوئے شعرا کی بھی اردو فارسی غزلیں درج ہیں۔

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی

ان کا تعلق بدایوں کے کائستھ گھرانے سے تھا۔ [illegible] میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے اور بدایوں میں ہی پنشن لے کر فارغ ہوئے۔ ان کے ہاں بھی علم و ادب کے پرستاروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ خود شعر کہتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے جس کا نام سحر سامری رکھا تھا۔ سحر نے ایک کتاب املا اور رسم خط پر بھی لکھی۔ ایک کتاب منطق پر بھی تصنیف کی جسے [illegible] میں مطبع نول کشور نے شائع کیا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"حجت تین قسم ہے۔ اول قیاس اور وہ استدلال ہے۔ حال کلی کا حال جزئی پر۔ جیسے کل انسان حیوان ہیں۔ اور حیوان جسم ہیں۔ بس قیاس ہوا کہ کل انسان جسم ہیں۔ پس حال کلی یعنی حیوان سے حال جزئی یعنی انسان پر دلالت ہوئی۔ دوم استقرا یعنی استدلال حال جزئی سے حال کلی پر۔ جیسے ہر انسان و طیور و بہائم کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ سب حیوانات کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتے ہیں۔"

مولوی محمد رضا لکھنوی

مولوی محمد رضا لکھنوی کا تعلق علمائے فرنگی محل کے خاندان سے تھا۔ ان کے اجداد میں سے ہی قطب شہید فرنگی محلی تھے۔ مولوی صاحب کے والد کا نام مولوی غلام یحییٰ خان تھا اور وہ شہر بنارس میں صدر الصدور تھے۔ خود مولوی محمد رضا بدایوں میں طبیب حاذق تھے اور ڈپٹی کلکٹر بھی رہ چکے تھے۔ یہاں سے پنشن لی تو بھوپال چلے گئے۔ انہوں نے رسالہ منہاج المنطق لکھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر بیلنٹین کے انگریزی رسالہ منطق کا اردو ترجمہ ہے دیباچہ یوں ہے:

"بجائے مصطلحات و الفاظ شدہ وہ منطق انگریزی کے بلفظہٖ مصطلحات و الفاظ مستعملہ منطق عربی داخل ترجمہ کئے اور التزام اس امر کا رکھا کہ محاورۂ زبان اردو بھی ساقط نہ ہو اور ترجمہ بھی لفظاً بلفظ ہو۔"

ترجمہ مطبع نولکشور میں سنہ ۱۸۸۱ء میں چھپا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"قضیہ صادقہ کا عکس کچھ ضرور نہیں کہ صادق ہو۔ مثلاً کل گھوڑے حیوان ہیں۔ قضیہ صادق ہے مگر اس کا عکس کہ کل حیوان گھوڑے ہیں کاذب ہے۔ اصل قضیہ میں ہم نے سب گھوڑوں کا ذکر کیا ہے نہ سب حیوانات کا اس لئے عکس میں ہم کو کل حیوان کے ذکر کرنے کے بجائے صرف بعض حیوانات کا ذکر کرنا چاہیے۔ اور اصل قضیہ میں اس بات کا ایجا نہیں پایا جاتا کہ کل حیوان گھوڑے ہیں، البتہ بعض کے ہونے کا پایا جاتا ہے۔

یہ اقوال جو دفعہ ۲۲ سے ۲۷ تک مذکور ہوئے بواسطہ اشکال کے بخوبی بیان ہو سکتے ہیں پہلے یہ قضیہ لو کل گھوڑے حیوان ہیں۔ اور فرض کرو کہ سب گھوڑے ایک مثلث میں گھیرے جاویں اور سب حیوان ایک دائرے میں، پس اس صورت میں اگر قضیہ مذکورہ صحیح ہے تو بالکل مثلث دائرے کے اندر گھر جائے گا اس طور پر مثلث کے دائرہ میں گھر جانے کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے کے کل افراد پر حکم ہے اور چونکہ گھوڑے کے سوا اور بھی حیوان ہیں اس لئے مثلث دائرہ کی تمام سطح پر محیط نہیں۔ اور اگر ہم اصل قضیہ کو منعکس کریں تو اس صورت میں کل حیوان تو محکوم علیہ ہو ہی نہیں سکتے مگر چند پس ہم کو حیوان کے ساتھ لفظ بعض کی بھی قید مکانی ضرور رہو گی اور ہم شکل میں بھی دیکھتے ہیں کہ دائرہ کی بعض سطح مثلث کے ساتھ منطبق ہے حالانکہ بالکل مثلث بعض دائرہ کے ساتھ منطبق ہے"

مولوی محمد علی تحصیلدار

ان کی پیدائش مراد آباد میں ۱۸۳۸ء میں ہوئی سرکاری ملازمت کرتے رہے ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا۔ مولوی محمد علی سرسید کے مخالفین میں سے تھے انہوں نے سرسید کی تفسیر قرآن کی زبردست مخالفت کی اور البرہان علی تجہیل من قال بغیر علم فی القرآن کی تفسیر کا رد کئی جلدوں میں لکھا۔ مولوی محمد علی بہت عالم فاضل انسان تھے۔ انہوں نے عیسائیوں کے الزامات کا بھی دندان شکن جواب دیا۔ اپنے مشہور رسالے "البرہان" میں مولوی محمد علی نے سرسید کی تفسیر میں سے بے شمار غلطیاں نکالی ہیں۔ ایک اقتباس اس کتاب کا ملاحظہ ہو۔

"قال: جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اس کی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے ان کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ پس وہ قریب اسی پہاڑ کے لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑگڑاہٹ اور زور شور کی آواز اور پتھروں کی آواز کے خوف سے بے ہوش ہو گئے۔

قلت: بیان واقعہ میں کس قدر مغالطہ کو کام میں لا رہے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کلمات ہیں۔ لَن نُّؤمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً یعنی ہم تجھ پر ایمان نہ لاویں گے جب تک اللہ کو عیاناً نہ دیکھ لیں گے۔ اس گستاخی اور کفر کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوا تھا اگر یہ کہتے کہ ہم خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ان پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا بلکہ حضرت موسیٰ ان کو سمجھا دیتے کہ تم خدا کو اس دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھا دیا تھا کہ لَن تَرَانِي اور چونکہ بقول سید الطائفہ سید احمد کے وہ پہاڑ آتش فشاں تھا اور آتش فشاں پہاڑوں کا حال جو کچھ ہے وہ کوئی عجائبات سے نہیں، ایک معمولی بات ہے اس سے تو صد ہا بڑھ کر عجائبات وہ دیکھ چکے تھے کہ ان کی نظروں کے سامنے بحر قلزم پھٹ گیا۔ اور پانی کے تودے کوہ ہائے عظیم کے برابر ان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور وہ خشکی میں ان تودوں کے درمیان عین قعر دریا میں ہو کر نکل گئے۔ عصا کی کیفیت دیکھ چکے تھے کہ اژدہا ہو کر ساحروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا۔ مقام رفیدیم میں ایک سنگ خارا سے بارہ چشمے پانی کے جاری کر دیئے۔ ان عجائبات کے مقابلہ میں ایک ایسے امر کو کہ دستور قدرت کے موافق ظہور اس کا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے وہ لوگ کس طرح پر عجائبات اور کرشمہ سمجھ سکتے تھے۔ اور ایسا امر معمولی کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کی نہ کچھ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، نہ ان کی عظمت، نہ ان کی نبوۃ و تقرب پر دلالت کرتا ہے۔ کسی طرح پر باعث اس کا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے اس مقولہ کفریہ سے کہ (لَن نُّؤمِنَ لَكَ) رجوع کریں۔ بلکہ یہ امر تو موجب ازدیاد کفر اور بدگمانی کا تھا کہ قوم کو دھوکہ دیا۔ خدا کے دکھلانے کا تو اظہار کیا اور کوہ آتش فشاں میں لے جا کر ان کی مٹی خراب کی۔ اور کیا بتدالطائفہ امیر سید احمد کے نزدیک وہ لوگ سب کے سب اندھے بہرے نادان ایسے مسلوب الحواس تھے کہ دور سے نہ گڑگڑاہٹ کی آواز سنی نہ آگ کے شعلے دیکھے نہ آگ کی گرمی ان کو محسوس ہوئی۔ اپنی موت ان کو نظر نہ آئی یہاں تک کہ اس مقام سے کہ جہاں سے یہ امور محسوس ہو سکتے تھے آگے تک بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایسے قریب پہنچ گئے کہ مرنے تک نوبت پہنچ گئی۔ . . . پس کسی طرح عقل باور نہیں کرتی کہ ایسے لوگ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے دیدہ دانستہ آتش فشاں پہاڑ کے قریب اپنی جان کھونے کو چلے جاتے اور ان سے یہ جھگڑا نہ کرتے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے دکھانے کے تجھ سے خواہاں تھے تو ہمیں آتش فشاں پر مار ڈالنے کے واسطے لئے جاتا ہے۔"

منشی امیر احمد مینائی

ان غیر معروف نثر نگاروں کے ضمن میں امیر مینائی کا ذکر بطور ایک نثر نگار کے آئے گا ایک شاعر کے طور پر نہیں، کیونکہ شاعری میں ان کا ایک منفرد اور مشہور مقام ہے۔ نثر میں ان کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ انہوں نے نثر کی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک کتاب تذکرہ شعراء بڑی قابل قدر کتاب ہے۔ ایک کتاب اردو لغت کی ہے جس کا نام امیر اللغات ہے۔ اگرچہ یہ ایک نامکمل لغت ہے پھر بھی اس کتاب نے آگے چل کر لکھنے والوں کی بڑی رہنمائی کی۔

امیر مینائی کی پیدائش نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے عہد حکومت میں ۱۸۲۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مولوی کرم محمد تھا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے مفتی سعد اللہ رام پوری اور فرنگی محل کے علماء سے حاصل کی، شاعری میں مظفر علی اسیر سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ یہ آتش، ناسخ اور انیس و دبیر کا دور تھا۔ چنانچہ امیر مینائی کو شہرت کے مقام تک پہنچنے کے لئے بڑی محنت اور ریاض کرنا پڑا۔ چنانچہ جوانی میں ہی انہیں اتنی شہرت ملی کہ واجد علی شاہ نے دربار میں بلوا کر ان سے کلام سنا۔ دو کتابیں واجد علی شاہ کے ایما پر لکھیں (ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان) اس کے عوض میں انہیں دربار شاہی سے خلعت ملی۔ جنگ آزادی کے بعد نواب یوسف علی خان نے امیر مینائی کو اپنا استاد بنا لیا۔ ریاست رامپور میں بڑی عزت اور قدر و منزلت سے زندہ رہے۔ داغ نے انہیں حیدر آباد بلا لیا۔ اس میں نظام حیدر آباد کی بھی خواہش شامل تھی۔ حیدر آباد دکن کی آب و ہوا امیر مینائی کو راس نہ آئی۔ چنانچہ دکن پہنچنے کے چند ہی روز بعد بیمار پڑ گئے اور ۱۹۰۰ء میں وہیں انتقال کیا۔ امیر مینائی سلسلہ چشتیہ صابریہ سے منسلک تھے۔ امیر مینائی ایک جید عالم تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت پر بھی عبور حاصل تھا۔ امیر مینائی کی شعری تخلیقات کا ذکر حصہ شعر میں تفصیل کے ساتھ آئے گا یہاں ہم صرف ان کی نثر کے بارے میں بات کریں گے نثر میں ان کی کتاب "انتخاب یادگار" سب سے پہلی کتاب ہے اس میں ان شعراء کا حال درج ہے جو رامپور میں رہتے تھے۔ یہ کتاب امیر مینائی نے حسب الحکم کلب علی خان بہادر کے لکھی۔ ۔ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"ایک دن بندگانِ حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعرائے ماضی و حال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص اس دار الریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی مختصر کیفیت سخن گوئی کی حقیقت نقش صفحہ روزگار ہو۔ اسی ضمن میں اعزاز اس ہیچمدان کا بھی منظور ہوا۔ لہٰذا یہ بندہ اس خدمت پر مامور ہوا اور محض بہ اقتضائے عطوفت خسروانی آغاز سے انجام تک بار بار حضور نے التفات فرمایا ـــــ تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمامی پر آیا۔"

اس کتاب کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"حیا، صاحب عالم مرزا رحیم الدین خلف صاحب عالم مرزا محمد کریم الدین شاہ بہادر کا سن ہے، جیسا ظاہر ہے ویسا ہی باطن ہے، بنہایت خوش طبیعت نیک خصال ہیں۔ آفرینش

سخن میں بڑے ذی کمال ہیں۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے ہیں۔ وطن قدیمی ان کا دہلی ہے۔ مگر مدت سے اسی سرکار فیض آثار میں تعلق ہے۔ مع اہل و عیال یہیں رہتے ہیں۔ مشق کا یہ عالم ہے کہ موزوں طبیعت سے دریا کی طرح بہتے ہیں۔ زبان اچھی، مذاق اچھا ہے۔ فکر بلند ذہن رسا ہے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔ اشعار ان کے قابل دید ہیں۔

تھے اک نگاہ میں مرے عقدے تمام حل
اتنا سا کام آپ کو دشوار ہو گیا
تڑپنا میرا نہ دیکھا گیا، یہ محض غلط
نہ دیکھنے کا مگر ان کو اک بہانہ ہوا
وہ دشمن صد چاک دامن اور سودا عشق کا
یہ بھی کیا میں ہو گیا، میرا گریباں ہو گیا
چین کیا آئے شب غم موت بھی آتی نہیں
یاں تو دم کا بھی نکلنا دل کا ارمان ہو گیا
ہاتھ ہے دل پہ پس مرگ اس لئے
درد نکل جائے نہ دم کی طرح
یہ میدان محشر ہے دنیا نہیں ہے
کہ ٹکڑے اڑا دو گے گھر سے نکل کر

حضرت امیر مینائی کی کتاب امیر اللغات کی دو جلدیں الف ممدودہ و الف مقصورہ کے الفاظ کی سنہ ۱۸۹۱ء میں چھپیں۔ امیر مینائی اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

"میں نے ہوش سنبھالا آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زباندان سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں۔ انہیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بنان کا شوق مجھے بھی ہوا۔ اور اس زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی کہ اردو الفاظ کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں۔ اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی اور غدر ہو گیا وطن کی تباہی اور گھر بار کے لٹنے سے چندے حواس ہی جمع نہ ہو سکے۔ الفاظ کیسے۔ لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی یہاں تک کہ فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والی رامپور نے مجھے طلب فرما کر خلعت اور اطمینان کا سرمایہ دیا۔ اب میں پھر اپنی تمنا کے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی میرے متعلق تھی۔ نواب فردوس مکاں اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے اور فن شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے تھے وہ یوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پا سکا کہ اپنے ارادے کو پورا کروں تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کا عہد آیا تب فرصت کی کمی اور بڑھی لیکن کچھ ہی ہوا یہاں وہی دھن بندھی رہی۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں علوم کے قدردان سر الفرڈ لائل صاحب بہادر (لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ) نے نواب خلد آشیاں سے اردو کی ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی۔ فوراً "الممدودہ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر کے ذریعے سے سر الفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیج دیا۔"

کتاب امیر اللغات کا ایک اقتباس پیش ہے۔

"آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی ہیں۔ یہ مثل اس جگہ بولتے ہیں جہاں کسی کام میں بہت کچھ محنت مشقت ہو چکے تھوڑی سی کوشش باقی رہے۔ داغ ؎

جو بیٹھیں آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی پل کی ہیں
رہی ہیں بس یہی آنکھوں کی سوئیاں باقی

اس مثل کی نسبت ایک کہانی مشہور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی عورت نے ایک شخص کو دیکھا کہ مردہ سا پڑا ہے۔ اور تمام بدن میں سوئیاں چبھی ہیں۔ سمجھی کہ کسی نے اس پر جادو کیا ہے۔ اس لئے کہ بقول مشہور ایک قسم کے جادو میں سوئیاں بھی چبھوتے ہیں وہ سوئیاں نکالنے لگی۔ سارے بدن کی سوئیاں نکال لیں۔ صرف آنکھوں کی باقی رہ گئی تھیں کہ ایک عورت وہاں اور آ گئی۔ اس سے اس نے کہا اب آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی ہیں تم یہاں ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کسی ضرورت کو گئی۔ اس عورت نے اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکال لیں۔ اور وہ شخص سحر سے نجات پا کر اٹھ بیٹھا۔ محبت اور ہمدردی اس عورت کی ثابت ہوئی جس نے آنکھوں کی سوئیاں نکالی تھیں"

حضرت امیر مینائی کے ذاتی خطوط بھی ان کی نثر کے دلکش اور یادگار نمونے ہیں۔ جناب داغ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مکرم سلامت۔ سلام مسنون۔ مدت کے بعد نوازش نامہ آیا۔ ممنون یاد آوری فرمایا۔ بندہ نواز مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہنچا ہو۔ بہر حال جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب بخطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھاپا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا۔ مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہیں تھا اس وجہ سے وہ سرور گھٹ گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے قلم سے فرمائی وہ میرے سرور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے شکایت جو آپ نے "صنم خانہ عشق" دیوان دوم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے۔ وہ دیوان چھپا کہاں، ورنہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا۔ معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے رشک و حسد سے نہ گزارا ہیں۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یک جائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہو گئے ہو۔ یہ شیوہ چھوڑو کر زبردستی رکاوٹ کے لئے ایک بات قرار دی ہے"

داغ کے خط کے جواب میں امیر مینائی لکھتے ہیں۔

"اول تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا یہ تو بالکل پسند نہیں میاں اب تو وہ وقت آ گیا کہ مرحوم مغفور کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو، کوئی اور حوصلہ نہیں۔ آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ میں کہتا کیا ہوں جو بھیجوں۔ جی افسردہ رہتا ہے۔ کبھی کسی گلدستے والے کے اصرار سے کچھ بکتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراغت چشم وہ آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں۔ خدا جمعیت خاطر بڑھائے۔ اے یار، استاد السلطان ہونے کی مٹھائی تو لاؤ "یا استاد" "یا استاد" برسوں کہا گیا ہے۔ اب جو وہ وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد۔ ایسے ہے کبھی کبھی رسم رسل و رسائل رہے ہیں ابتدا سے تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں، میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

امیر فقیر۔ ۳۱ مارچ سنہ ۱۸۹۱ء

(یہ خط ایک نادر یادگار ہے۔ کیونکہ یہ خط مکتوبات امیر مینائی میں شامل نہیں ہے) ایک خط انہوں نے عابد علی کوثر خیر آبادی کو لکھا۔ ملاحظہ ہو۔

۸۔ مارچ ۱۸۹۸ء

مجھی حکیم صاحب! سلام مسنون! مہربانی نامے نے پہنچ کر شکر گزار یاد آوری کیا۔ اب تک آپ کا ناکام مرام ہونا سخت افسوس کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسب دل خواہ کامیاب فرمائے یہ داعی خیر دعا سے کسی وقت غافل نہیں ہے۔

بھانا پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک مستحسن الترک ہے۔ جیسے دیں ہی، کی جگہ بول چال میں بہائے آ جاتا ہو، مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گزرا، حکم اس کے استعمال کا نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت امیر مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیوں کر رہ گیا اور میں نے بھی اسے دیکھا ہے تو سوا اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے

انکھڑیاں بہ چشم معشوق کے لئے مخصوص ہے۔ اور یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے بھٹنا لفظ تھو ہے۔ بدھتا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صباؔ سے

شور جس کا ہے وہ ہے عشق جنوں زا دل میں
بدھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں

ایجاد مذکر ہے۔ سند کے واسطے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آج کل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں اور جا بجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغؔ کا قول ہے کہ دلی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور نظیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔ نسیمؔ دہلوی سے

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارک باد مرگ   یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

میرؔ سے

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں
راتوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

اگرچہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے وہ سند کے لئے پورے طور سے کافی نہیں ہو سکتا۔ مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے غافل لکھنوی سے

اتنی بینائی کہاں دیکھیں جو سیر جزو و کل
عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں

دشنام زیادہ مونث ہے مگر ظفرؔ نے ایک جگہ مذکر باندھا ہے لہٰذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے۔ ناسخؔ سے

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی   تو گویا پیمبر کو دشنام دی

داغؔ سے

بارہا میں گیا ہوں نزد امام   کبھی مجھ کو نہ دی کوئی دشنام

ظفرؔ سے

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے   خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے
ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہم کو   کاہے کو سننے کے دشنام کسو کے آتے

امیر فقیر

پنڈت گردراج کشور دت

پنڈت جی کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم ہو سکا کہ وہ آگرہ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے ابتدائی تعلیم سینٹ جانسن کالج آگرہ سے حاصل کی سرکاری ملازمت میں رہتے آخر میں سب جج ہوئے اور پنشن کے بعد آگرہ ہی میں قیام رہا۔ پنڈت صاحب نے کئی ایک قانونی کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے۔ ان کی کتاب آئینہ وکالت ان کی اپنی تصنیف ہے اور اس اعتبار سے اپنی نوعیت اور افادیت میں ایک انوکھی اور سبق آموز کتاب ہے کہ اس میں ان اخلاقیات سے بحث کی گئی ہے جو وکالت کے پیشے سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ کتاب ہذا کی نسبت کسی قسم کی اختراع کا دعویٰ کرنا میری جانب سے ایک قسم کی گستاخی ہوگی۔ مگر اس قدر میں جرأت کر کے کہہ سکتا ہوں کہ نصف سے زیادہ مضمون کتاب ہذا کا میرے ذاتی تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہے۔"

کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

—خودی اور طمع سے ہمیشہ وکیل کو سخت پرہیز کرنا چاہیے۔ خودی یا غرور ایسی بڑی چیز ہے کہ جس شخص میں یہ ہوتی ہے وہ اپنے آپ پر نامناسب اور بے جا طور پر فخر اور ناز کرتا ہے مگر بالعموم لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اپنے دل میں پھر اس کی وقعت نہیں سمجھتے ہیں۔ طمع ایسی بری شے ہے کہ یہ انسان کی طبیعت سے نیکی اور بالعموم عمدہ اور پسندیدہ صفات کی بیخ کنی کرتی ہے۔ ایک مشہور مصنف فارسی نے کیا خوب کہا ہے

مصرعہ طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی یعنی طمع کے تین حروف ہیں اور تینوں خالی ہیں۔ اور ایک انگریزی مصنف نے طمع کے مندر کا ذکر کیا ہے اور مندر کا طمع کو دیوتا قرار دیا ہے اور طمع کا دیوتا بیٹھا تھا اس کی غلیظ لمبی ڈاڑھی تھی اور ضعیف چہرہ بھوک کا مارا ہوا تھا اور اس کے چاروں جانب روپیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور اس کے دو مصاحب یعنی داہنی طرف ظلم صاحب اور بائیں طرف بخل صاحب تشریف رکھتے تھے اور پانچ چھ افسران منتظم مسمیان بے ایمانی اور رشوت ستانی اور استحصال بالجبر اور فریب وغیرہ تھے اور وہاں بہت سے بڈھے اشخاص قریب المرگ روپیوں کی تھیلیوں پر تکیہ لگائے لیٹے ہوئے تھے اور جوں جوں ان کی حالت جانکنی کی ہوتی تھی اتنی ہی حسرت کے ساتھ وہ روپیہ کی تھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے جلدی پکڑ لیتے تھے۔ مگر وہ سب ایک بڑے زبردست جن سے جس کا نام افلاس تھا بہت کانپتے تھے بعد اس طور پر صورت طمع اور اس کے متعلقات کے بیان کرنے کے ہمارے مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ جس وقت اس مقام پر افلاس داخل ہوا، سب لوگ خوف سے کانپنے لگے۔ مگر ہم نے آگے بڑھ کر اس سے اس طور پر التجا کی اے افلاس تو مجھ کو کبھی دکھائی نہ دینا اگر تو یہ میری عرض قبول نہ کرے تو اس بات کا خیال رہے کہ تیری دھمکی اور گیدڑ بھبکی سے مجھ میں کوئی بات ناشکرے پن یا غیر منصفی کی نہ آوے۔ اور اگر دولت میرے پاس آئے اپنے ہمسایہ خودی اور طمع کے آوے تو اے افلاس تو جلدی سے آکر مجھ کو بچا اور اپنے ساتھ اپنی دو بہنوں یعنی آزادی اور بے فکری کو لا، جن کی صحبت میں تو ہمیشہ خوش رہتا ہے:

نواب محسن الملک

سرسید کے عہد کے جن غیر معروف ہم عصروں کا ہم نے ذکر کیا ان میں صرف امیر مینائی ایسے ہیں جو مشہور ہوئے اور تاریخ ادب میں جن کا ایک مقام ہے۔ ان کے سوا اس عہد کے کسی ادیب کا ذکر ادب کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ البتہ ان کے بعد نواب محسن الملک جیسے کچھ ایسے مشاہیر ہو گزرے ہیں جو صاحب طرز تھے اور جن پر سرسید کا گہرا اثر تھا۔ نواب محسن الملک کا پورا نام سید مہدی علی تھا۔ ان کے والد صاحب کا نام میر ضامن علی تھا۔ نواب محسن الملک اٹاوہ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۸۳۷ء تھا۔ تعلیم اٹاوہ میں حاصل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مختلف مقامات پر نوکری کرتے رہے۔ مسٹر ہیوم نے ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اہلمد مقرر کیا غدر ہوا تو نواب محسن الملک پیشکار تھے ۱۸۶۱ء میں ترقی کرتے کرتے تحصیل داری تک جا پہنچے۔ اس زمانے میں دو کتابیں تصنیف کیں جن کا تعلق قانون فوجداری اور قانون مال سے تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے شیعہ سے سنی ہونے کا اعلان کیا اور اس کے بعد ایک کتاب آیات بینات لکھی ۱۸۶۷ء میں مرزا پور میں ڈپٹی کلکٹر کے طور پر تعینات ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں حیدرآباد میں بارہ سو روپیہ مشاہرہ پر انسپکٹر جنرل ریونیو مقرر ہوئے ۱۸۸۴ء میں انہیں نواب منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب ملا ۱۸۸۴ء ہی میں اعلیٰ معتمد مال مقرر ہوئے سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد پولیٹیکل سیکریٹری بن گئے۔ سہ ہزاری منصب اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ لگ گئی اور خطاب محسن الدولہ محسن الملک مل گیا۔ اس کے بعد ریاست کے کچھ معاملی مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے دکن سے انگلستان روانہ ہوئے۔ آخر بیس برس کے بعد پنشن لے لی۔ اس اثناء میں سرسید سے ان کے گہرے مراسم پیدا ہو چکے تھے۔

یہ کمال کی بات ہے کہ شروع شروع میں نواب محسن الملک سرسید کے مذہبی عقائد کو ہرگز ہرگز پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے نام سے بیزار تھے لیکن مرزا پور میں ملازمت کے دوران سرسید کو قریب

سے دیکھنے کا موقع ملا بس پھر کیا تھا سرسید کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان سے بڑھ کر سرسید کا اور کوئی خیرخواہ اور دوست ہی نہ تھا چنانچہ پنشن پانے کے بعد سرسید کے ساتھ علی گڑھ میں ہی قیام کیا اور باقی زندگی قومی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ نواب محسن الملک نے ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں شملہ میں وفات پائی اور علی گڑھ میں سرسید کے قریب دفن ہوئے۔ حالی نے اس موقع پر نہایت درد بھرا قطعہ کہا تھا۔ یہ قطعہ انہوں نے دسمبر ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کے کراچی والے اجلاس میں سنایا تھا۔

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار　　سر کر کے مہم، قوم کے کام آ گیا آخر
سیّد کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا　　اس کو بھی رہی قوم کا غم کھا گیا آخر
یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی　　دنیا کو تماشا یہ۔ وہ دکھلا گیا آخر
مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری　　کہرام ہے کشمیر تا راس کماری

نواب محسن الملک نے بڑے بڑے مشکل مقامات پر سرسید کا بڑی پامردی سے ساتھ دیا۔ کالج میں ایک لاکھ روپے کا غبن ہو جانے سے حالت بڑی خراب ہو گئی تھی لیکن نواب محسن الملک نے سرسید کو حوصلہ دیا اور اپنی ہمت اور کوشش سے اتنا چندہ جمع کر دیا کہ علی گڑھ کالج اس مشکل سے نکل گیا اور پھر سے طلبہ اس میں داخل ہونے لگے۔ کالج کا اعتماد پھر سے بحال ہو گیا۔

ان کی کتاب آیاتِ بینات خالص مذہبی کتاب ہے۔ ۱۸۷۱ء میں مرزاپور کے مشن پریس میں چھپ میں یہ چھپی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"پس ہم لوگوں کو فقط اسلام کے نام پر خوش ہونا اور صرف توحید اور نبوت کے اقرار پر اپنے کو ناجی سمجھنا نہ چاہیئے بلکہ ہر عقیدے کی تحقیق کرنا اور ہر اعتقادی مسئلے کی تطبیق کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے دینا ضرور ہے اور یہ ممکن نہیں کہ جو شخص اپنے سچے اور صاف دل سے صرف اپنی نجات کی امید پر خدا کی کتاب کو دیکھے اور تعصب اور عناد کو دخل نہ دے، وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے اور ایسے حق کے طالب کو خدا گمراہی میں پڑا رکھے۔ ہاں جو کوئی پہلے سے سچائی کا طالب نہ ہو اور مذہبی تعصب میں گرفتار ہو اور سوائے مجادلے اور مکابرے کے اسے کچھ منظور نہ ہو اور اپنے آبائی دین و مذہب کو تقلیداً سچ جانتا ہو۔ وہ بے شک ایسی گمراہی میں پڑا رہے گا اور اپنے دل کو باطل عقیدوں سے کبھی پاک و صاف نہ کر سکے گا۔"

اب نواب محسن الملک کے ایک مضمون "موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ" میں سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تمثیلی انداز نگارش ہے۔

"ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا اور اس طلسم کدے کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصورِ قدرت نے کھینچ رکھی ہے، دکھایا۔ درحقیقت میں سنا سے ویسا ہی پایا جیسا سنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا تو ایک چاردیواری دیکھی جو میرے خیال سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ . . . میں نے وہاں ایک رفیق پایا جس کا نام خرد تھا۔ اس سے حقیقت اس کی پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کے اندر ایک ایسا پرفضا باغ ہے جسے جنت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو۔ . . . میں چند روز اس باغ میں رہا، پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلاتا۔ . . . آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چاردیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا۔ مگر دروازہ کھلا ہوا اور دیوار شکستہ . . . میں نے اپنے رہنما سے پوچھا . . . اس نے کہا یہ وہ باغ نہیں ہے، دوسرا ہے۔ پہلے اس باغ کی طرح آراستہ تھا خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا۔ اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا۔ . . . جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامی رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ . . . اس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے چلا . . . تب تاریخ نامی ایک روشن ضمیر ملا۔ اس نے کہا کہ ہزار برس ہوتے ہیں تب میں اس باغ میں آیا تھا نہایت تروتازہ سبز و شاداب تھا جیسا وہ باغ جو تم نے اوّل دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا۔ اور گندے چشمے پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ چشمے پر آ گیا ہے۔ تب تو میں نے خیال کیا اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لے کر چلا۔ مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور پتھر سرکانے پر مجھ کو موت کا خوف دلایا میں جان بچا کر ہٹا۔ . . . میں نے چاہا کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور یہ پتھر جیسا ہے ویسا ہی رہنے دوں۔ پر استقلال نامی ایک خیرخواہ نے میرا دل بڑھایا اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اس نے کہا میں نے ایمان نامی فقیر سے سنا ہے کہ اس چشمے کا ایک کھودنے والا ہے۔ وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اس کی راہ میں اوّل تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے۔ جس میں سوائے آنکھوں کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں، اگر اس سے بچ گئے تو رسوائی اور بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اس کا ملتا ہے جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے۔ . . . پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمہاری رسائی ہوئی اور اس نے تمہاری نذر لے لی تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کر دے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے۔ سب کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے۔ اور تمہارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے . . . .

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں اس قدر یہ کہہ کر "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں، پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی علوم قدیم کا باغ ہے جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے وہ پتھر جو سرچشمہ پر آ گیا ہے جہالت ہے۔ وہ مدّی نالے گندے پانی کے، رسم و رواج کی پابندی، بیجا تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا مذہب، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عامیانہ غلامی، ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے" چپ ہو رہا۔

نواب محسن الملک کا دلچسپ اور عالمانہ انداز تحریر کا نمونہ۔

"طبیعیات جاننے والا مسلمانوں میں کوئی نہیں رہا۔ ہاں چند مسائل کا بیان اس زمانے کے عالم اس طرح پر کرتے ہیں کہ عناصر چار ہیں۔ خاک، باد، آب، آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں۔ خاک کے اوپر آب اور آب کے اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے اور وہ بہت بڑا ناری کرہ ہے آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے مگر چونکہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے اس لئے وہاں مشتعل بھی کم ہے۔ اور اس سبب سے اس کی شکل ہلیلجی ہو گئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے کہ اہلیلجی کی کیا شکل ہے تو استاد اپنی سرمہ دانی نکال کر دکھاتے ہیں کہ ایسی بیچ سے موٹی، دونوں طرف سے پتلی۔ پس اس زمانے میں عالموں کی یہ طبیعیات رہ گئی ہے جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔"

"ہندسہ و حساب کچھ باقی ہے۔ اقلیدس کا ایک مقالہ اور خلاصۃ الحساب کی تحصیل اربعہ یا جذر تک فضیلت کی پگڑی بندھوا دیتی ہے مگر طالب علم یہ سوچتے ہیں کہ تحریر

اقلیدس کے پڑھنے اور ان ٹیڑھی سیدھی شکلوں کے بتانے میں کیا فائدہ؟

• نباتات کی تحقیقات اعلیٰ درجہ پہنچ گئی ہے۔ اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں نے لکھا ہے کہ سراندیپ میں ایک درخت ہے جس پر کلمہ لکھا ہوا ہے۔ نہ زمین پر اس کا پتہ گرتا ہے نہ کوئی جانور اسے کھا سکتا ہے۔ ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالموں کو اس پر یقین ہے کہ بعض بوٹیاں ایسی ہیں جن سے سونا چاندی بن سکتا ہے۔

• علم حیوانات میں بلاشبہ بڑی ترقی ہے۔ کیونکہ اپنے ہاں کے بڑے بڑے عالموں کو تقریر کرتے سنتے ہیں کہ اگر بکری کتے سے بچہ پیدا ہو تو اس کا کھانا درست ہے یا نہیں؟

ایک مضمون میں مسلمانوں کی ترقی اور زوال کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے بڑے جوشیلے انداز میں لکھتے ہیں۔

"غرض کہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے ہادی کی یہی ہے کہ وہ استعداد جو فطرت میں خدا نے رکھی ہے وہ کام میں لائی جاوے، اور دنیا و دین کی ساری نعمتیں حاصل کی جاویں قرآن اسلام کی بنی ہوئی وہ زنجیر نہیں ہے جس میں ہم دنیاوی ترقیات کے لئے جکڑے ہوئے ہیں، بلکہ برخلاف اس کے وہ ان بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اس سے روکنے کے لئے لگائے تھے۔"

غور کرو خدا کی اس جھڑکی پر جو رہبانیت اور جوگی بننے کے لئے ہے کس نے خدا کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لئے پیدا کی، پڑھو خدا کی یہ آیت جو دنیاوی لذتوں سے متمتع ہونے کے لئے ہے۔ اچھی چیزیں جو ہم نے روزی کی ہیں کھاؤ اور اچھے کام کرو۔ . . . دیکھو کیا عام اجازت نامہ ہے خدا کا دنیا کمانے کے لئے، زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو، اور پھر خدا اپنے اچھے بندوں کو کیا دعا سکھاتا ہے۔ اے خدا ہم کو دنیا اور آخرت میں بھلائی دے، یعنی دنیا اور دین دونوں کی بھلائی جبکہ قرآن کے یہ احکام ہوں اور طلب معیشت اور تجارت اور کسب حلال کے لئے صاف صاف ترغیبیں اور بشارتیں جیسا کہ ہمارے ہادی نے طلب معیشت کے لئے فرمایا ہو بعض ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں رنج اٹھایا جائے اور تجارت کے لئے ارشاد ہوا۔ سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اٹھے گا، اور طلب دنیا کے لئے صاف صاف لفظوں میں یہ خوشخبری سنائی ہو کہ جو شخص دنیا کو بطریق حلال تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال کرنے سے بچنا اور آل اولاد کے لئے کوشش اور ہمسایہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے اس کا منہ خدا کی ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند کا سا ہوگا، تو کیا ایسا مذہب دنیاوی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ ان کے لئے خط آزادی ہے۔"

نواب محسن الملک سرسید کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"پس باوجود ان تمام باتوں کے اس مجلس کا ترقی نہ کرنا بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قوی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے مقام اور مجلس کی کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے، تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر اس کا اجلاس ہوگا اور چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت اور اس میں شریک ہونے کے لئے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے اس لئے سوائے چند پرانے ارکان اور چند مدرسے کے طلبہ اور چند وزیٹرز کے باہر سے نئے نئے لوگ نہیں آتے اور بہ وجہ اس کی ریزولیوشن بہت کم پاس کئے جاتے ہیں اور ان پر بھی وقت سے بحث کی نوبت نہیں آتی۔ لوگوں کے دل سرد ہوتے اور ان کے ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور نظم اور نثر خوانوں نے اس مجلس کو بزم مشاعرہ بنا دیا ہے اور واہ واہ قاہ قاہ کی آواز نے اس مجلس کو بجائے قومی مجلس کے ایک دل لگی کا جلسہ کر دیا ہے۔"

۱۹۰۶ء ۳۱ دسمبر کو نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کی تھی۔ یہ ان کی آخری تقریر تھی، کیونکہ اس کے بعد اسی سال ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تقریر کا اقتباس اختصار کے ساتھ ملاحظہ ہو۔

"حضرات! کانفرنس کے اب تک کامیاب نہ ہونے کا اصل سبب یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ رہی قوم کی حالت، اس میں کبھی کسی قسم کی ترقی نظر نہیں آتی، نہ ان کی صلاح و فلاح کے آثار معلوم ہوتے ہیں، بلکہ روز بروز ان کا افلاس بڑھتا جاتا ہے اور ان کی قوتیں دن بدن منتشر اور ضائع ہوتی جاتی ہیں، اس کا سبب کچھ پوشیدہ نہیں ہے اس لئے کہ قوموں کی صلاح و فلاح دو فرقوں پر منحصر ہے، اول علماء دوسرے امراء، مگر علماء اپنے اصل فرائض کا خیال نہیں رکھتے اور زمانے کی رفتار اور زمانے کی ضرورتوں کو نہیں دیکھتے . . . مثلاً اگر کسی عالم سے کہا جائے کہ اس زمانے میں جبکہ مسلمان مفلس اور تباہ ہو رہے ہیں اور علوم و فنون اور صنعت و حرفت سے ناواقف ہیں ان کو علوم و فنون جدید اور سائنس کی تعلیم کی ہدایت کیجئے اور صنعت و حرفت سیکھنے کی ترغیب دیجئے، تو وہ یہ کہہ کر سائنس اسلام کے مخالف ہے اور صنعت و حرفت دنیاداروں کا کام ہے۔ ہماری بات کو نہایت نفرت سے سنیں گے۔ حالانکہ یہ باتیں اور اس قسم کی ہدایت و نصیحت اس زمانے میں ان پر فرض کفایہ ہے اور اس کے ادا نہ کرنے سے وہ خود گنہگار ہو رہے ہیں اور ساری قوم کو عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بوجہ ناواقفیت علوم اور نہ جاننے صنعت و حرفت کے وہ دنیا کی قوموں کے مقابلے میں ذلیل و خوار ہیں۔ مگر وہ ہرگز اس کی ہدایت نہ کریں گے اور بجز نماز جنازہ اور دفن میت اور جواب سلام وغیرہ کے ان باتوں کو فرض کفایہ نہ سمجھیں گے۔

ہمارے زمانے کے ایک مصری عالم نے اس افسوسناک حالت کو دیکھ کر نہایت رنج و غم سے یہ لکھا ہے کہ انہیں علماء کا فرض کفایہ سے ناواقف ہونا اصلی سبب اس کا ہے کہ ساری قوم صنعت و حرفت کے فوائد سے محروم ہو گئی ہے اس کی تائید میں وہ عالم لکھتا ہے کہ اس وقت جو شخص مسلمانوں میں کسی صنعت کے زندہ کرنے یا آلہ کے ایجاد کرنے یا کوئی کمپنی قائم کرنے یا کوئی مدرسہ جاری کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیگا تو شریعت کے حکم کیمطابق اس نیک کام کا اور قیامت تک اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا اور یہ شخص قوم میں اعلیٰ درجے کا مصلح اور مجدد ہوگا۔ اسے لکھ کر وہ عالم صاف صاف کہتا ہے کہ مغربی علوم میں جو قرآن مجید کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں اور اسلامی علوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بقائے زندگی کا ذریعہ ہے، اور یہ روحانی زندگی قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ بغیر ان دونوں کے اسلام اور ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

حضرات کتنے ایسے عالم اس وقت ہم میں ہیں جو ان باتوں کو سن کر غصے میں نہ آویں گے اور ان باتوں کو نیچریانہ کلام سمجھ کر اس سے متنفر ہوں گے اور یہ سن کر کہ صنعت و حرفت کا سکھانا اور اس کی ہدایت کرنا اصل عبادت ہے، اس کے کہنے والے کو نیچری اور کافر نہ کہیں گے جبکہ ہادیان طریقت کا یہ حال ہو اور وہ خود سیدھی راہ سے بہکے ہوئے ہوں تو قوم اور امت کیونکر منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے۔"

نواب وقار الملک

نواب وقار الملک کا نام مشتاق حسین تھا۔ امروہہ ضلع مراد آباد میں ۱۸۳۹ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ والد کا نام شیخ تفضل حسین تھا۔ ان کے اجداد شاہجہان کے عہد میں دیوان تن کے عہدے پر فائز رہے۔ نواب وقار الملک ابھی ماں کی گود میں ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ محترمہ نے انہیں بڑی لگن اور محبت سے پالا پوسا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد صدر الصدور اور پھر رشتہ دار اور پھر منصرم کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۵۷ء

میں نائب تحصیلدار ہو گئے۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر چنے گئے۔ ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو انہوں نے اس میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ اس وقت وہ سرسید کے ہمرکاب تھے۔ ۱۸۷۵ء میں نواب وقار الملک حیدرآباد دکن بلالئے گئے۔ نواب صاحب اپنی اخلاقی جرأت فرض شناسی اور حق گوئی کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے اس کے باوجود سرسالار جنگ ان کے بڑے قدردان تھے اور ان کی پاکیزگی فطرت اور حق گوئی کی دل سے قدر کرتے تھے۔ سرسالار جنگ کے ریزیڈنٹ کے چلے جانے اور امیر کبیر کے انتقال کے بعد نواب وقار الملک دوبارہ حیدرآباد گئے اور پھر عرصہ بارہ برس تک وہاں خدمت کرتے رہے اور ریٹائر ہو کر واپس آئے۔

قیام حیدرآباد کے دوران نواب وقار الملک سرسید کے قومی مشن کو آگے بڑھانے میں برابر ان کی مدد کرتے رہے اور علی گڑھ کالج کے استحکام کے لئے انھوں نے ہزاروں روپے اپنے پاس سے دیئے نواب صاحب کی صاف گوئی اور حق پسندی کی وجہ سے ایک بار سرسید سے بھی ان کا اختلاف ہو گیا لیکن کثرت رائے کے فیصلے کو انھوں نے بھی تسلیم کیا۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی سرگرم کوشش کی اور اس کے پہلے سیکرٹری چنے گئے۔ یہاں نواب محسن الملک کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کے لئے مخلصانہ کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں جب سر آغاخان نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی اور گورنمنٹ کی منظوری کی امید دلائی تو نواب صاحب نے اس کے لئے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں بیس لاکھ روپیہ کے قریب چندہ جمع کیا ان ہی دنوں جنگ طرابلس چھڑ گئی چنانچہ طرابلس کے مجروحین کے لئے نواب وقار الملک نے اپنے گاؤں کا ایک حصہ فروخت کر کے ایک ہزار روپیہ چندہ دیا۔ اب وہ بیمار رہنے لگے اور طبیعت میں ضعف آ گیا تھا۔ آخر ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء کو امروہہ میں انتقال کیا۔

نواب وقار الملک ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ انہوں نے ترجمہ اور تالیف کا کام بھی کیا۔ انہوں نے "ریولیوشن اور نپولین" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام "سرگذشت نپولین بوناپارٹ" رکھا اور اسے مطبع نول کشور نے شائع کیا۔ اگرچہ وہ زیادہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے دو مددگار رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے تہذیب الاخلاق کے لئے بھی بے شمار مذہبی و قومی مضامین لکھے ان کی تحریروں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۸۸۹ء میں سید محمود کے آئندہ سیکرٹری بنانے پر جب نواب صاحب نے سرسید کی پرزور مخالفت کی تو اپنی رائے کے سلسلے میں لکھا۔

"میری خود بھی کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے لکھتا اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے۔ انسانوں کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو ان سے معذرت کر کے صفائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن قوم اور ملک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ بخشواتا پھرے گا۔ تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا"

۱۹۱۱ء میں شاہی دربار دہلی کے موقع پر حکومت نے تقسیم بنگال کو منسوخ کیا تو اس موقع پر نواب وقار الملک نے مسلمانوں کو ناامید ہونے سے روکا اور حکومت کی غاصبانہ حکمت عملی پر بھی سخت اور بے لاگ تنقید کی۔ انہوں نے لکھا۔

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھی جاتی ہے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور بعد اس کے کہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں، الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جو اب مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ ایسے لاحاصل بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر ہم کو بھروسہ کرنا چاہیئے وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل ابنائے وطن نے پیش کی ہے، ہمارے سامنے موجود ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک ترکٹر کے تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا۔ بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔ کس کا سر کچلا اور کس کی ٹانگ ٹوٹی اور کہاں کا ایران کہاں مصر سے اسلام ہی کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔"

ایک جگہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکا ہے۔

"اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں کہ ہم کو حکومت کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے۔ وفاداری عرض ہے۔ وہ جوہر نہیں۔ اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے اور جس قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا، وفاداری بھی لامحالہ متزلزل ہوگی۔ پس مسلمان جو من حیث القوم بحیثیت کانگریس سے اب تک علیحدہ ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم، عام مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں۔ ان کا سوراج مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ہے۔"

۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے ہنگامہ محشر کے سلسلے میں اپنی بے باک رائے یوں لکھتے ہیں۔

"بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ دیر تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور سے متعلق مسلمانان صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک نائیٹر نہیں آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہیئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لئے نائیٹر ثابت ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعتاً ہمارے جذبات کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتے گا۔ اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت برقرار رکھیں یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں؟"

(تذکرہ وقار الملک۔ مرتبہ مولوی امین زبیری)

مولوی چراغ علی

مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا اصل وطن کشمیر تھا۔ وہاں سے یہ لوگ پنجاب آکر آباد ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد پنجاب سے ترک وطن کر کے میرٹھ کو اپنا وطن بنالیا۔ مولوی چراغ علی کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا اور وہ پنجاب اور سرحد میں مہتمم بندوبست رہ چکے تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو مولوی چراغ علی ابھی بچے تھے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہی حاصل کی اسی علاقے میں خزانے کے منشی مقرر ہوئے۔ بعد میں لکھنؤ میں نائب مہتمم بن گئے۔ سیتاپور میں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی۔ اور دونوں کی دوستی کا آغاز ہوا اسلام اور دین اسلام کی اشاعت اور ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح تربیت کے بارے میں دونوں کے خیالات ایک تھے۔ بڑے مستقل مزاج اور صاحب رائے انسان تھے۔ ابتدائی ایام میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے لیکن بعد میں عربی اور فارسی کے علاوہ کلدانی اور یونانی زبانوں میں بھی بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ انگریزی خوب جانتے تھے۔ ان کی انگریزی کا اعتراف بڑے بڑے انگریز بھی کرتے

تھے اسلامی فرقوں میں بے تعصب تھے، ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں، ۵۰ برس کی عمر میں بمبئی شہر تک ہوا مولانا حالی نے جسٹس سید محمود کے ایک فقرے کو قطعہ کی شکل دے کر تاریخ وفات یوں نکالی۔

زخمے از مرگ چراغ علی آمد بردل — کہ از و خاطر افکار بغم شدہ جفت
از وصال و فاتش چو بجستم محمود — شد خیاں حیف چراغ علی از دنیا گفت
۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی نے بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ اسلام و حقانیت اسلام ان کا پسندیدہ موضوع تھا لیکن قانون اور معاشیات و مالیات پر بھی کتابیں لکھیں۔ بقول حامد حسن قادری، مولوی چراغ علی صاحب کی فضیلت علمی اور کمال تحقیق کے سلسلے میں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مولوی صاحب کے کاغذات میں مرزا غلام احمد قادیانی کے چند خطوط نکلے ہیں جن میں مرزا صاحب نے اپنی تصنیف "براہین احمدیہ" کی تیاری میں مولوی صاحب سے علمی اعانت چاہی ہے۔ ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۰ء میں مرزا قادیانی نے کئی خط مولوی صاحب کو لکھے ایک خط ملاحظہ ہو۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا خط

اس خط میں جو مرزا غلام احمد قادیانی نے مولوی چراغ علی صاحب کو لکھا ان کی تحقیقات اور مضامین کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں اور میں نے ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے۔ تصنیف کی ہے اور نام اس کا براہین احمدیہ علی حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں اور اپنے محکم کلام کو ان سے زیب و زینت بخشوں۔"

مولوی چراغ علی طریقہ استدلال میں سرسید کے حامی تھے اور مسئلے کے ایک ایک پہلو پر خوب خوب بحث کرتے ہیں۔ مثلاً اعظم الکلام کے ابتدائی صفحات کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"جدید قانون زن و شوکی وجہ سے، جس کی پیغمبر خدا نے اپنے پیروؤں کو تلقین کی اور بعض دانشمندانہ عادلانہ اور سخت قیود سے، آپ نے طلاق کی سہولت کو بھی رفع کیا، یہ قیود بہت ہی معقول ہیں، اور ان میں طرفین کے فائدے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن میں اہل عرب کو نصیحت اور تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں خراب رسوم ترک کر دیں، آنحضرت صلعم نے غلامی کو موقوف کر کے لونڈیوں کے رکھنے کے رواج کو بھی موقوف کر دیا اور اس وقت جو عورتیں غلامی کی حالت میں تھیں ان سے عقد کر لینے کی تاکید کی، ورنہ وہ لونڈیاں بنا کر رکھی جاتیں۔ شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدید احکام ہیں، اور اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ عقبیٰ میں اس کا بڑا عذاب ہوگا، اس طرح عرب اور دیگر اسلامی ممالک سے دختر کشی کی رسم بالکل اٹھ گئی۔ سب سے اول قرآن میں قانون وراثت ایسا قائم کیا گیا کہ اس میں عرب کی عورتوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا گیا۔"

رسائل چراغ علی کے تیسرے رسالے (تحریر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام) میں یوں استدلال کیا ہے۔ ایضاً

"ا۔ مولوی محمد علی صاحب کی تقریر جو خاصلانہ تحریر کی پوری تصویر ہے نور الآفاق نمبر (۵) مطبوعہ کانپور مطبع نظامی میں چھپ کر میرے پاس پہنچی جو تعلیم ہم مسلمانوں میں ان دونوں عمدہ اور کافی تصور کی جاتی ہے۔ اس کا یہ ٹھیک ٹھیک فوٹو گراف ہے۔

۱۲۔ آزاد اور خود مختار مخلوقات کا غلام بنانا ایک ایسی بد نامی اور ارباب دانش کی نظر میں حقارت و ذلت ہے جس کو ہر ایک شخص جو ادنیٰ سی بصیرت رکھتا ہو اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے۔ اور اس امر میں کچھ شک ہی نہیں کہ خدا نے ہر ایک شخص کو آفرینش کی راہ سے ایک ہی سی حیثیت عقلی و جسمانی کا پیدا کیا ہے اور تمام مخلوقات فطرت کی راہ سے باہم مساوی ہیں پس اگر فطرت میں آزادی ہے تو سب کے سب آزاد ہونے چاہئیں یا اس کے برعکس، ورنہ در اصل قدرتی فرق اور فطرتی تمیز آزاد اور غلام میں نہیں پائی جاتی۔

۱۳۔ لاتبدیل لخلق اللہ (روم ۳۰۔ آیت ۲۹) خدا کی بناوٹ میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ ایک بڑی مضبوط اور قوی دلیل ہے۔ اس بنائی ہوئی حالت اور جبری و قہری صورت کے بطلان کی، جو ابتدا میں نامِلائم حرکات والی زبردست قوم نے اپنے مغلوب قیدیوں کو غلام بنا کر جبر یہ ان کو فطرتی حقوق، قدرتی اختیار اور طبعی آزادی سے محروم رکھا تھا۔ پس غلام بنانا اور اس کی جان و مال پر تصرف کرنا خلقت الٰہی میں تغیر کرنا ہے۔ اور اسی بات کی پیشین گوئی شیطان نے پہلے کی ہے۔ (النساء ۴۔ آیت ۱۱۸) اور ضرور ان کو سکھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ بدل دیں۔"

اور جب غلامی کی یہ صورت ہو تو کیونکر تسلیم کیا جائے کہ اسلام نے باوجود حق اور رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور تمام جہان کو تہذیب اور حکمت سکھانے کے، پھر بھی ایسی رسم قبیح و مخالف فطرت کو کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھا ہو۔ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور استرقاق (غلام بنانا) دونوں جمع ہو سکیں۔

۱۴۔ آغاز اسلام اور ابتدائے وحی سے غلاموں کی حالت میں اصلاح اور غلامی کے انسداد کے لئے کوشش ترغیب اور تکرر و تدبیر کی گئی اور شروع ہی میں اخلاق اور موعظت کی راہ سے قیدیوں کی آزادی کی رغبت دلائی گئی۔

مکہ میں جب غلاموں کی آزادی کا بہت چرچا اسلام کی بدولت ہوا تو غلاموں کے مالکوں میں کھلبلی پڑ گئی جیسی کہ اب غلامی کی حمایت کرنے والوں میں ہے، ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے "سیرت محمدی" میں لکھا ہے۔

"جب دین اکرم حضرت محمدؐ نے غلامی کی آزادی کا اعلان کیا تو ان میں بہت جوش پھیلا حتیٰ کہ عبداللہ بن جدعان نے جس کے پاس بہت سے غلام تھے، چاہا کہ ان کو مکہ سے کہیں اور بھیج دیا کہ ایسا نہ ہو وہ سب کے سب مسلمان ہو جائیں۔"

(سیرت محمدی صفحہ ۱۸۵ مطبوعہ الٰہ آباد ۱۸۵۱ء)

سبحان اللہ! اس زمانے میں تو اس طرح قولاً و موعظۃً اور شرعاً غلاموں کی آزادی کا حکم دینے اور آزاد کر دینے سے اسلام کی نیک نامی اور غیر مسلم اقوام کا حسن ظن حاصل کیا جاتا تھا، اور ایک یہ زمانہ ہے کہ جس میں اگر کہیں ضمناً بھی غلامی کے عدم جواز کا ذکر آ جائے تو بڑے بڑے مولوی صاحب، اسلام کو بدنام کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں اور نور الآفاق کے اوراق سیاہ کئے جاتے ہیں۔"

مولوی محمد حسین آزاد

مولوی محمد حسین آزاد ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے، ہمدان کا خاندان شیعہ مجتہدین کا خاندان تھا۔ آزاد کے والد صاحب کا نام مولوی محمد باقر تھا جو جنگ آزادی (غدر) میں اپنی حق گوئی کی وجہ سے شہید کر دیئے گئے۔ مولوی محمد باقر نے دہلی سے اردو کا پہلا اخبار نکالا جو "اردو اخبار" کے نام سے چھپا تھا یہ ۱۸۳۶ء کا واقعہ ہے۔ بقول حامد حسن قادری صاحب اگر یہ اردو کا پہلا اخبار نہیں تو کم از کم دہلی کا پہلا اردو اخبار ضرور تھا چونکہ آزاد کے والد کے استاد ذوق سے بڑے گہرے مراسم تھے اس لئے آزاد نے ذوق ہی کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کی ہمراہی میں دہلی کے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ آزاد نے قدیم دہلی کالج میں بھی تعلیم حاصل کی، اس کالج میں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب ان کے ساتھ پڑھتے تھے، ذوق کی وفات کے بعد آزاد نے کچھ دنوں حکیم آغا جان عیش سے فیض سخن حاصل

غدر کے ہنگاموں میں آزاد کو پے در پے ذہنی جذباتی اور مالی صدمے پہنچے۔ سب سے بڑا صدمہ یہ پہنچا کہ ان کے باپ مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے باڑھ مار کر شہید کر دیا کتاب آزاد کے مکمل «سوانح حیات» شائع کردہ کتاب گھر دہلی ۱۹۶۳ء میں اس جانکاہ واقعے کو یوں درج کیا گیا ہے۔

"غدر کے ہنگامے میں آزاد کے والد بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اور دہلی دروازے کے باہر ایک میدان میں باغیوں کے ساتھ محصور و نظر بند کر دیئے گئے۔ یہ حادثہ آزاد کے لئے کیا کم المناک و جاں گداز تھا کہ آزاد کو غائت محبت کے سبب سے اس حالت میں والد کی زیارت کا شوق ہوا۔ اس وقت دہلی کی ایسی فضا تھی کہ باہر چلنا پھرنا بھی خطرناک تھا آخر آزاد کو فوج کے سکھ جرنیل کا خیال آیا جو ان کے والد کا دوست تھا۔ اس کے پاس گئے اور رہائی کی آرزو بیان کی۔ اس نے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ انہوں نے دل کی تڑپ کا اظہار کیا آخر اس نے کہا کہ تم میرے سائیس کا لباس پہن کر میرے ساتھ چل سکتے ہو اور کوئی تدبیر نہیں۔ چنانچہ آزاد سائیس کے حلیے میں سکھ جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس میدان محشر میں پہنچے۔ جہاں قیدی اپنی زندگی کی آخری ساعتیں گن رہے تھے۔ انہیں لوگوں میں ایک طرف کو ایک مرد خدا عبادت میں مصروف تھا چہرے پر اطمینان و سکون کے آثار تھے۔ یہی آزاد کے شفیق بوڑھے باپ تھے جن کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی۔ بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا لاڈوں کا پالا جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ادھر یہی حالت بیٹے پر گزری۔ دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی جب نظر نے یاوری کی تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں کہ بس آخری ملاقات ہوگئی اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اس اشارے کے بعد انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا لیکن نہ ہوسکا وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے اور اس وقت تک اس وفادار جرنیل کی حفاظت میں رہے جب تک شاہجہان آباد کی یہ مظلوم روحیں قفس عنصری میں قید رہیں۔"

غدر کے ہنگاموں میں آزاد کا گھر بھی لوٹ لیا گیا۔ آزاد اپنے گھر کے اثاثے میں سے صرف اپنے استاد ذوق کا دیوان اٹھا کر مع بال بچوں کے گھر سے نکلے اور دہلی چھوڑ لکھنؤ آ گئے۔ وہاں بھی گردش تقدیر نے دم نہ لینے دیا۔ آخر ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور یہاں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے میر منشی کی سفارش پر بہ مشاہرہ پندرہ روپے سررشتہ تعلیم میں نوکر ہوگئے۔ ڈائریکٹر تعلیم میجر فلر بڑے علم پرور انسان تھے۔ انہوں نے آزاد کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائیڈ نے آزاد کو سرکاری اخبار "اتالیق" کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا "اتالیق" کے بعد آزاد اخبار "پنجاب میگزین" کے بھی سب ایڈیٹر رہے ۱۸۶۵ء میں انہوں نے بخارا اور ایران کا سفر کیا۔ ایران میں آزاد نے جدید فارسی کو پڑھا اور اس میں خاصی استعداد پیدا کی چنانچہ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک عرصہ تک فارسی و عربی کے پروفیسر رہے ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے پچاس سالہ جشن تاج پوشی پر آزاد کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ ۱۸۸۹ء میں آزاد حالت جذب و مستی میں رہنے لگے۔ باقی زندگی انہوں نے اس حالت جذب و مستی میں گزار دی۔ اور یوں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء بروز مطابق ۹ محرم ۱۳۲۸ھ میں آزاد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

آزاد اور جدید شاعری

اب حالی بھی لاہور پہنچ گئے تھے۔ آزاد پنجاب میں سررشتہ تعلیم میں تھے۔ آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ کی تائید سے جدید شاعری کا دور شروع ہوا۔ ایک بزم ادب "انجمن پنجاب" کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس سے پہلے مشاعروں میں طرحی غزلیں پڑھی جاتی تھیں لیکن انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں مختلف موضوعات قومی اخلاقی اور قدرتی مناظر اور زندگی کے حقائق پر پڑھی جانے لگیں۔ اس ضمن میں آزاد کی مثنوی "زمستان" "ابر کرم" اور حالی کی "حب وطن" "برکھا رت" وغیرہ اس زمانے کی یادگار نظمیں ہیں۔ اس ایجاد کا خیال سب سے پہلے آزاد کو آیا۔ اور یوں وہ جدید شاعری کے بانیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے جدید نظموں کو رواج دیا۔ "انجمن پنجاب" کا سب سے پہلا مشاعرہ ۹ مئی ۱۸۷۴ء کو ہوا۔

آزاد کی تصنیفات

جس زمانے میں آزاد محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے انہوں نے کرنل ہالرائیڈ کی فرمائش پر قصص الہند اردو ریڈریں، قواعد اردو وغیرہ مرتب کیں۔ بچوں کے درس کی یہ بہترین کتابیں ہیں اور اس سے بہتر درسی کتابیں آج تک نہیں لکھی گئیں۔ آزاد کے بعد اگر کسی نے بچوں کے لئے درسی مواد لکھا تو وہ اسمٰعیل میرٹھی تھے۔

۱۔ آب حیات (تذکرہ شعرا) ۲۔ نیرنگ خیال دو حصے (رمزیہ تمثیلی مضامین) ۳۔ دربار اکبری (شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے کی تاریخ) ۴۔ سخندان فارس (فارسی علم اللسان) ۵۔ نگارستان فارس (تذکرہ شعرائے فارسی) ۶۔ ترتیب دیوان ذوق (مع حالات و تشریحات) ۷۔ نظم آزاد (قومی و اخلاقی نظموں کا مجموعہ)

ان کتابوں کے علاوہ جو کتابیں آزاد کی وفات کے بعد ان کے قلمی مسودات کو مرتب کر کے شائع کی گئیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۸۔ تذکرہ علماء (مشاہیر ہند کا تذکرہ) ۹۔ سپک و ناک (آزاد کی مجذوبانہ تحریر) ۱۰۔ کائنات عرب (جغرافیہ و احوال عرب) ۱۱۔ لغت آزاد (اردو الفاظ کے فارسی مترادفات) ۱۲۔ ڈراما اکبر (افسانہ جہانگیر و نور جہاں) ۱۳۔ سیر ایران (سفرنامہ) ۱۴۔ فلسفہ الہیات (مجذوبانہ تصنیف) ۱۵۔ جانورستان (حالات حیوانات) ۱۶۔ مکتوبات آزاد (مجموعہ خطوط) ۱۷۔ بیاض آزاد (آزاد کے پسندیدہ اشعار) ۱۸۔ خمکدۂ آزاد (غزلیات و منظومات)

جدید اردو شاعری

عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کو شاعری کے جدید رنگ کا بانی اور اردو ادب کا مجدد سمجھنا بالکل بجا ہے۔ جدید اردو شاعری کی بنیاد رکھنے کا سہرا آزاد ہی کے سر ہے۔ آزاد ہی وہ ادیب اور شاعر ہیں جن کو سب سے پہلے اردو شاعری کے تنزل کا احساس پیدا ہوا۔ انہوں نے قدیم رنگی اور تقلیدی شاعری کے خلاف سب سے پہلے صدائے احتجاج بلند کی۔ اور شعر کے اصل نصب العین کو عوام کے روبرو پیش کیا۔ جدید شاعری کی تاریخ "انجمن پنجاب" ہی کے پہلے جدید مشاعرے سے قائم کی جاسکتی ہے۔ جدید شاعری کی پیدائش مشاعرے ہی میں زیادہ آسانی کے ساتھ ہوسکتی تھی کیونکہ مشاعرے کو اس طرح جدید خیالات کے نشر و اشاعت کا ذریعہ بنانے سے ایک بڑا فائدہ یہ متصور تھا کہ اس سے لوگ برسوں سے مانوس تھے۔ اور اس میں جو چیز پیدا ہوتی وہ جلد سے جلد تمام علمی حلقوں میں پھیل جاتی تھی۔ چنانچہ اس نئی طرز کے مشاعروں کی بنیاد ابھی مستحکم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اس میں حصہ لینے والی، اور اس کے نصب العین سے ہمدردی رکھنے والی ایک بڑی جماعت لاہور میں پیدا ہوگئی۔ ان میں مولانا حالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا حالی نے تلقین اور عمل دونوں طرح اپنے آپ کو اصلاح شاعری کے لئے وقف کر دیا تھا۔

آزاد کی ان علمی کوششوں نے انہیں عوام اور حکومت کی نظر میں ایسا بلند کر دیا کہ ۱۸۶۵ء میں حکومت کی سفارتی اغراض کے لئے کسی شخص کو کابل بھیجنے کی ضرورت پڑی تو اس کے لئے آزاد کا انتخاب ہوا۔ اس تعلق سے آزاد بخارا پہنچ گئے ۱۸۸۵ء میں دوسری بار ایران گئے۔ قیام ایران کے زمانے میں انہوں نے لسانی تحقیقات کا مواد ہی فراہم نہیں کیا بلکہ جدید فارسی سے واقفیت حاصل کر لی۔ چنانچہ آزاد کی فارسی تصنیفات ان کی علمیت اور ذوق کا سچا آئینہ ہیں۔

لاہور میں آزاد کی سرکاری خدمات کئی نوعیتیں رکھتی ہیں۔ آزاد کا ستارہ اس وقت شہرت کے کمال پر تھا۔ سرکاری اور علمی حلقوں نے ان کی بڑی قدر کی لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ان پر جنون کا حملہ ہوا اور اس کی وجہ ان کی لاڈلی بیٹی کی وفات تھی جس کے ساتھ آزاد کو بے حد پیار تھا۔ اس صدمے سے ان کے دل و دماغ متاثر ہوئے اور وہ تصنیف و تالیف سے ہمیشہ کے لئے معذور ہوگئے۔ آزاد جنون کو لازمۂ شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کی اعلیٰ قابلیت جو نظموں سے زیادہ ان کی نثر میں نمایاں ہے۔ آزاد کے بلند

شعری تخیل کا ثبوت ہے۔ آزاد کے کارنامے تقریباً سب کے سب اعلیٰ پایہ ادبیت سے مملو ہیں۔ وہ فطری شاعر تھے اور دہلی کے آخری مایہ ناز شعراء کی محبتوں میں ان کی نشوونما ہوئی تھی۔

آزاد کا انداز نگارش

آزاد میں اچھے اور برے شعر کو پرکھنے کا بڑا ملکہ تھا زبان اور اس کی نزاکتوں کو سمجھنے اور برتنے کی ان میں خاص قابلیت تھی۔ وہ نہ صرف اچھے شاعر اور ادیب بلکہ بلند پایہ نقاد بھی تھے۔ آزاد کی طبیعت میں چھان بین کا فطری مادہ تھا اس قوت محرکہ نے عربی فارسی کے علاوہ ان کو بعض ہندوستانی زبانوں میں بھی ملکہ پیدا کرنے پر ابھارا وہ اپنے زمانے کے بڑے ماہر لسانیات تھے۔ اردو پر اس نقطہ نظر سے آزاد ہی نے سب سے پہلے تصنیف و تالیف کی۔ جمالی احساس بھی ان میں بہت قوی تھا۔ انہیں فطری اسباب نے مل جل کر ان کا ادبی مذاق نہایت پاکیزہ اور بلند کر دیا تھا۔ اپنے معاصرین میں آزاد سب سے زیادہ صناع ادیب تھے، بلکہ شاید اردو میں ان کے پایہ کا ادیب کم نکلے۔ آزاد کا شاہکار "آب حیات" ان کی اعلیٰ پایہ ادبیت کا کھلا ثبوت ہے اس کے اسلوب میں جو رنگت اور سادگی ہے، وہ بہت کم انشا پردازوں کی تحریروں میں مل سکے گی یہی وجہ ہے کہ تذکرے کے بہت سے واقعات غلط ثابت ہونے کے باوجود اس کی ادبی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسلوب بیان کی وجہ سے یہ آج بھی ویسا ہی مقبول ہے جیسا پہلے تھا۔

آزاد کا رتبہ اردو ادب میں بہت بلند ہے کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جس وقعت کی نظر سے دیکھ سکتی ہے آزاد بھی اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔ انہوں ہی نے قدیم شاعری کی اصلاح کا سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور انہوں نے ہی جدید شاعری اور دلکش نثر کا تخم بویا۔ آزاد ہی کی بدولت نیچرل شاعری کے مفہوم سے لوگ آشنا ہوئے اور آزاد ہی کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر جدید دور کے سخن طرازوں نے اپنی اپنی عمارتیں تعمیر کیں۔

آزاد کی شاعری کی روح سے کماحقہ واقف ہونے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی شاعری اور دوسرے شعراء کے کارناموں میں کیا مناسبت ہے۔ نیز جدید شاعری کے معماروں میں ان کا کیا رتبہ ہے آزاد نظم کی نسبت نثر کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نثر کے مقابلے میں پھیکی معلوم ہوتی ہے یہ آزاد کی نظموں کا قصور نہیں بلکہ تقابلی مطالعے کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ آزاد کے نثری کارناموں سے ہٹ کر محض ان کی شاعری پر نظر ڈالئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ قدیم شاعروں کے آراستہ چمن سے نکل کر آپ ایک ایسے خود رو صحرا میں پہنچ گئے ہیں جہاں کی ہر چیز اپنی تہذیب اور خوبی کے لئے صرف دست قدرت کی ممنون ہے۔ اس میں صبح اور شام کے سمے، پرندوں کی چہکار، پھولوں کی مہک، آبشاروں کا ترنم، سبزہ زاروں کی دلکشی، پہاڑوں کی بے ترتیبی خود حسن فطرت کا ایک خزانہ ہے۔ اس جگہ بہت کم چیزیں بے ضرورت معلوم ہوتی ہیں۔ ساتھ میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے انسانی صنعت گری نے فطرت کی دست کاری کو بہت کم ضائع کیا ہے میر حسن، نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے بعد آزاد اردو کے سب سے بڑے منظر نگار شاعر اور نثار ہیں۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ گہرائی نہیں۔ لیکن لفظی شان و شوکت جیسی کہ آزاد کی شاعری میں ہے، سودا کے بعد کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کا اثر ذوق کی شاعری خصوصاً قصیدہ نگاری کی توسط سے آزاد پر بہت پڑا تھا۔

آزاد کی نظم

آزاد نثر کی طرح نظم میں بھی حسن لفظی کے پابند ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی حقیقی اشیاء کا تخیلی سماں خوب باندھ سکتے ہیں۔ ان کی بعض مثنویوں میں ایسے ٹکڑے ملتے ہیں جن میں آزاد منظر نگاری کی اصل خوبی تک پہنچ گئے ہیں اس ضمن میں آزاد کی شاعری، اسلوب کے اعتبار سے نظیر اکبر آبادی سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ مثنوی "شب قدر" میں جہاں انہوں نے رات کا سماں باندھا ہے، وہ نظیر اکبر آبادی کا خاص رنگ اور انداز ہے لیکن آزاد اور نظیر کے بیانات میں فرق یہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی مقصدیت کی طرف زیادہ مائل ہیں اور آزاد اپنے ماحول سے حقائق کا انتخاب کرتے ہیں۔

مثلاً۔

دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گل خود رو نے عجب لطف دکھایا ہے وہاں
مخمل سبز سے ہے سبزہ تماشا انداز
رنگ گل اس پہ دکھانے میں تماشا انداز
ہر سر کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری
پھرتی بن بن سے دکھاتا ہے عجب سرشاری
سنگ مرمر کی لب آب جو اک سل ہے پڑی
اس پہ اک رشک پری، ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی
رنگ رخ کو گل گلزار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی اک پاؤں کو ہے پانی میں لٹکائے ہوئے
اس پہ ہے چتر کی جا سایہ نخل سبز نہال
پھول برساتی ہے پھولوں میں کھڑی باد شمال

میر حسن بھی بلند پایہ منظر نگار ہیں، لیکن ان کی تفصیلات کی مقصدیت نے انہیں آزاد سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ نظیر کی گھلاوٹ اور شیرینی آزاد کی نظموں میں کم ہے لیکن آزاد کا اصل جوہر اس کے پُر شکوہ بیانات ہیں۔ آزاد کے پاس شاعری ایک اصلاح کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس لئے فطرتاً وہ انیس کی طرح بے روک نہیں لکھ سکتے تھے۔ یہی چیز ان کے کلام کو میر انیس کے رتبہ تک پہنچنے سے روکتی ہے۔

غرض آزاد کی شاعری ان کی نثر کے مقابلہ میں عجیب متضاد خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ ان کے کلام میں شعریت ان کے ہم عصر حالی سے زیادہ ہے۔ حالی کے برخلاف آزاد کے سامنے کوئی اخلاقی مقصد لکھتے وقت موجود نہیں تھا۔ اس لئے اس کے کلام میں حالی کی نسبت زیادہ فطریت ہے لیکن شعری بندشوں سے غالباً آزاد کی طبیعت رکتی ہے۔ انہوں نے اپنی نثر کی طرح نظموں میں روانی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی یہی سبب ہے کہ ان کے کلام کے بعض مقامات نہایت سست اور پر تعقید رہ گئے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار پڑھنے سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ "آب حیات" کے مصنف ہی کا کلام ہے۔

سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر
ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے
دامان دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے

(شب قدر)

اس وقت تو تو چھایا ہوا ہے جہان پر
چھایا ہوا سماں ہے زمین آسمان پر
آتی ادھر صبا ہے، ادھر سے نسیم بھی
اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی

(ابر کرم)

بقول عبد القادر سروری صاحب۔ ایسے مقامات آزاد کے کلام میں ضرور کھٹکتے ہیں تاہم ان کے مقابلہ میں آزاد کے وہ پارے بھی ہیں جو صفائی اور خوبی ادا کی وجہ سے ان کے تمام معاصر شعراء کے کلام میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

جب طور دم صبح شب تار کا بدلا　　اور رنگ چمن میں گل و گلزار کا بدلا
شبنم نے گہر فرش کئے خاک کے اوپر　—　اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر
چھپنے کو چلے آنکھ لگے مارنے سارے　　اور چاند پہ جانوں کو لگے وارنے سارے
آئی جو صبا لوٹ کے نسرین و سمن میں　　انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں

لی صبح کے پہلو میں ادھر رات نے کروٹ   لی خاک پہ یاں مست خرابات نے کروٹ
زاہد جو ابھی کی طرح جھوم رہا تھا   اور بیٹھا مصلّے پہ زمیں چوم رہا تھا

صدا کے ساتھ اڑے سب کے خواب آنکھوں سے
دلوں سے اٹھ گئے پردے، حجاب آنکھوں سے
نظر اٹھا کے جو دیکھا عیاں ہے نام خدا
کھلا ہے فیض کا در بہر بندگان خدا
جلوس ہے ملک القدس کا بروئے سریر
نگاہ ذرہ و خورشید ہے بسوئے سریر
زبسکہ ذات مقدس ہے اس کی ذات کمال
کھڑے ہیں دست ادب باندھے سب صفات کمال

(مصدر تہذیب)

آزاد جدت طراز تھے۔ ان میں جدت کے ساتھ پرگوئی بھی تھی کبھی کبھی اپنی قابلیت پر بھروسہ کر کے وہ شعر کے سرانجام میں زیادہ اہتمام سے کام نہیں لیتے تھے۔ لیکن اس سے ان کے کمال پر کوئی حرف نہیں آسکتا کیونکہ ان کے کلام میں شعریت کے اجزا نے ان کے پایہ کو معاصرین میں بہت بلند کر دیا ہے آزاد کے کلام میں جوش ہے وہ ہمارے جذبات کو حالی کے کلام سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ حالانکہ حالی کے شعر نہایت ہی کوشش سے سرانجام کئے جاتے تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ آزاد لطیف نگاری کے اس قدر دلدادہ تھے کہ جب تک ہر شعر میں کوئی نزاکت نہ پیدا ہوتی انہیں پسند ہی نہ آتا تھا پھر بھی آزاد کا شعری آرٹ بہت ہی سادہ ہے بعض وقت تو ان کے کلام میں ایک کمسن بچے کی توتلی باتوں کا لطف آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید حسن کا والہانہ احساس کا یہ عالم تھا آزاد نے یوں تو مثنویاں، ترکیب بند، ترجیع بند لکھے لیکن ان کی کوئی نظم مثنوی "خواب امن" کی خوبی کو نہیں پہنچ سکی۔ "شب قدر" اور "صبح امید" بھی آزاد کی اچھی مثنویاں ہیں لیکن ان میں اول تو آزاد کے سٹائل کی بہت کم خصوصیات موجود ہیں دوسرے جو زور، اور صفائی "خواب امن" میں ہے وہ ان میں نہیں ہے۔ یہ نظم اردو شاعری میں ممتاز ہے۔ اس میں استعارے کے پیرایہ میں انہوں نے امن و امان کے فائدے بیان کئے ہیں یہ آزاد کا خاص اسلوب تھا جس کی وجہ سے اس کی تصنیف "نیرنگ خیال" بڑی مقبول ہوئی۔ مثنوی "صبح امید" "گنج قناعت" "وداع انصاف" میں بھی آزاد نے اسی طرح کے استعارے سے کام لیا ہے لیکن یہ مثنویاں باوجود کم طویل ہونے ایسی چست نہیں ہیں جیسی کہ مثنوی "خواب امن" ہے۔ تفصیلی بیانات کی خوبی کے اعتبار سے بھی یہ مثنوی ایک خاص کارنامہ ہے۔ آزاد کا تخیل اس نظم میں اوج ثریا پہ ہے۔ بھرتی کے شعر اس نظم میں بہ نسبت دوسری نظموں کے بہت کم ہیں۔ الفاظ کی نشست، استعاروں کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے یہ نظم آزاد کی مخصوص ذہنیت اور ان کے آرٹ کا منتہا ہے۔ اس طرح کی نظم لکھنا آسان کام نہیں۔ کیونکہ شاعر کو استعارے کے نبھانے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اور جب وہ سرانجام پاتی ہے تو دلچسپی کا خزانہ بن جاتی ہے۔ اس طرز کی نظم میں آج تک کوئی اردو شاعر آزاد سے بازی نہ لے جاسکا۔ اس مثنوی کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ جہاں خسرو امن کا دربار" کا منظر بیان کیا گیا ہے۔

میں کہ آشوب جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت
امن کو سمجھا غنیمت، دل غم دیدہ بہت
شوق دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھ کو
پر عجب عالم نیرنگ دکھایا مجھ کو
خسرو امن تھا واں جلوہ فزائے دربار
دیتی فرحت تھی دل و جان کو ہوائے دربار
اس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا
آپ تھا پھولوں کے جھولوں میں پڑا جھول رہا
فیض کا جھونکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا
گل خورشید تھا واں ہر گل شاداب سدا
دھوپ کی جا تھی مگر چادر ماہتاب سدا
صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں
نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں
ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہاں ہردم آگے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے
دولت و عیش و طرب تھے امرائے دربار
کہتے تھے نظم و نسق جملہ، برائے دربار
دل میں افکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں
ہاتھ جمعیت خاطر کے تھے سب کام وہاں
مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے
دامن امن و امان خلق پہ پھیلائے ہوئے
شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

اس دور کے شعراء میں آزاد ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو اصلاح کا براہ راست ذریعہ نہیں بنایا جس چیز کو وہ حقیقی شاعری سمجھتے تھے اس کے نمونے پیش کرنے پر انہوں نے اکتفا کی۔ اس لئے ان کی شاعری اصلاحی پروپیگنڈے سے پاک ہے۔ یہ کام انہوں نے تمام تر اپنی تقریروں سے لیا۔

ایک چیز جو آزاد کے کلام میں خاص طور پر مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ آزاد کی جدید شاعری کا مطمح نظر ہمیشہ ایک رہا۔ ان کی راہ میں حالی، شبلی وغیرہ کی طرح کبھی تذبذب پیدا نہیں ہوا۔ ان کی شاعری فطرت پرستی، حقائق کی تلاش اور حیات انسانی کے حسین اور شگفتہ پہلوؤں کی خاکہ کشی کی ایک مسلسل کوشش نظر آتی ہے۔ آزاد کے ذہن میں شعر کا جو معیار تھا، اس کو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں یوں بیان کیا ہے۔

"نظم درحقیقت ایک شاخ گل ریز فصاحت کی ہے۔ جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے مختلف خوشبوئیں محسوس دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہوتی ہے، کسی کی بوست، کسی کی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن، اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے۔ جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں کبھی ہار میں، کبھی عطر کھینچ کر، کبھی عرق میں جا کر، کبھی دور سے کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں، اور مختلف عبارتوں میں رنگارنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں؛

"نظم اور کلام کے باب میں خیالات"

یہی آزاد کی شاعری ہے اور یہی اس کا اسلوب اس لحاظ سے آزاد بڑی حد تک اپنے شعری نصب العین تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس تقریر میں انہوں نے شعر کے ساتھ ساتھ رفعت خیال اور تاثیر معنوی کو بھی متعلق کیا ہے۔ یہ آزاد کا میدان نہیں تھا، جہاں بلند پروازی اور فلسفیانہ گہرائی کی کوشش کرتے ہیں، ناکامی سے سابقہ پڑتا ہے۔ آزاد کی شاعری پژمردہ دلوں کو بہلا سکتی ہے دامن خیال سے گرد کو دھو سکتی ہے لیکن خیال کو عروج اور ذہن کو قوت پرواز عطا نہیں کر سکتی۔ شگفتگی، ترنم، لطافت،

نفیس تشبیہوں اور طویل استعاروں کا استعمال آزاد کی شاعری کا خاص رنگ ہے۔ اس رنگ میں ان کی شاعری منفرد ہے۔"

(عبدالقادر سروری۔ "جدید اردو شاعری")

نثر میں آزاد کا اسلوب

حامد حسن قادری نے اس بات میں بڑی پتے کی بات لکھی ہے کہ ــ "اگر کسی شخص کو آزاد کے سوانح زندگی، انقلاب و مصائب، انتاد طبع اور جذب و جنون کا حال معلوم نہ ہو اور وہ ان کی آب حیات، نیرنگ خیال، قصص الہند، دربار اکبری، سخندان فارس وغیرہ کتابیں جو آثار جنون سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں۔ مطالعہ کرے تو پڑھنے والا آزاد کی تحریر کی جدت و دلکشی اور آزاد کی ذہانت و رعانت طبع سے متاثر ہونے کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے گا کہ یہ مصنف "خیالی بندہ اور عالم خیال کا رہنے والا ہے اس کی ذہنی فضا احساسات و تاثرات سے بھری ہوئی ہے جس میں اس کا دل اور رواں کے ساتھ قلم اڑتا چلا جاتا ہے"

نثر آزاد کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

"اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا، البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا اور ان کے معتقد باقی تھے، اور استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا، یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا چہرے پر ابٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ، تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوت بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔"

(آب حیات، زبان اردو کی تاریخ)

"جب وہ صاحب کمال (استاد ذوق) عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا جس کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔"

(آب حیات تذکرہ ذوق)

"نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف (سودا) نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم (استاد ذوق) کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا اور انہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا انوری، ظہیر، نظیری، عرفی، خاقانی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔"

(قصائد پر رائے)

"حضرت عشق نے شادی کی تھی، اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا، ہمایوں کو دم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ . . . جدھر کا رخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی، دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ یہاں تو موت منہ کھولے کھڑی تھی۔"

(دربار اکبری)

بادشاہ اکبر کی ولادت کا حال یوں لکھتے ہیں۔

"اس عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک، اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ ستارہ ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا۔ آفتاب ہو کر چمکے گا اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔"

(دربار اکبری)

الف۔ "تم ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں ان کی ایک زبان ہوگی۔ اسی کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں رہ سہ کر بولتے ہوں گے اور ایک ہی الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام دیتے ہوں گے، یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان سے اس طرح نکلی ہوں گی جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جدا ہو گئیں۔"

(سخندان فارس صفحہ ۱)

ب۔ "ہندوستان میں صاحب لوگ لباس تجارت میں آئے تھے، چونکہ تاجروں کا رہنا سہنا ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا۔ اول اول معاملات بھی بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں ہی سے ہوں گے، عام مسافرت میں انہیں نوکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انہیں سے لئے ہوں گے، عالی شان مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو کوٹھی کہتے ہیں، چونکہ صاحب لوگ لباس تجارت میں تھے، جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے۔ کوٹھی پر جا کر ملتے ہوں، وہ پوچھتے ہوں گے۔ آپ کی کوٹھی کہاں ہے؟ یہ پتا بتا دیتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے، کہ کوٹھی گھر کو کہتے ہیں کیونکہ مسافر تھے۔ ان کی دکان اور کوٹھی ایک ہی تھی ان کے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں گے۔ یہ چیز ہماری کوٹھی پہ لے جاؤ، اور لوگ کہتے ہوں گے۔ یہ چیز صاحب کی کوٹھی پر دے آؤ۔ مدت کے بعد تجارت کا پردہ اٹھا دیا۔ وہ گھر دار الحکومت ہو گئے جب سے کوٹھی کا نام جو محاورہ میں لگ گیا تھا وہی رہا، اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔"

(سخندان فارس)

ج۔ اور اب عبدالرحیم خانخاناں کی بچپن کی مصیبتوں کا حال سنیے: "وہ تین برس کی جان (عبدالرحیم خانخاناں) کیا کرتا ہوگا۔ سہم کر رہ جاتا ہوگا، ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا۔ ددا کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بیچاریاں کہاں چھپائیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی! تیری پناہ! عجب وقت ہوگا۔ شام غریباں اسی کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گزری ہوگی۔ دن ہوا، تو روز محشر۔"

(دربار اکبری صفحہ ۵۶)

د۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کا حال اردو زبان میں یوں ہے: "فتح یابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے واپس باپیش جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے، کچھ بھاگے ہوں گے وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے۔ کچھ فتح یابوں کی غلامی اور خدمت گاری میں کام آئے ہوں گے۔ اور وہی شودر کہلاتے ہوں گے چنانچہ اب تک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں، کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔"

(آب حیات صفحہ ۷)

ہ۔ "تم دیکھنا وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے۔ آسمان سے تارے اتاریں گے۔ مقدور دانی سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے، لیکن نہ وہ پرستش کر ساحری کی طرح عاجز ہوں۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی

لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے۔ سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے بے اثر کا عالم ہوگا۔"

(آب حیات تمہید دور سوم)

"عجائب اتفاقات سے یہ ہے کہ اسی صدی کے سنہ ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھول دیا اس میں فصاحت نے شربت اور سلاست نے دودھ بہایا اور گلستاں ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی۔ جس کا آج تک جواب نہیں ہے — چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں۔ اور کتری کتری عبارت ہے — مگر خدا نے اس کے بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں ایسا لوچ دیا ہے کہ ریشم کے لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ صنائع بدائع کی دستکاری نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ مگر سادگی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کے ننھے ننھے فقرے آیت۔ اور حدیث کی طرح اب تک تقریروں اور تحریروں کو قوت دیتے ہیں مزا یہ ہے کہ جو چٹخارہ زبان کو نظم پڑھنے میں آتا ہے۔ وہ اس کی نثر میں آتا ہے کیونکہ اس کی فطرتی فصاحت نظم و نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔"

(سخندان فارس۔ تیسرا لیکچر صفحہ ۶۳)

"دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے نہیں بڑھا جاتا۔ یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو۔ کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں۔ اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے۔ اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھنوروں کے اڑنے سے تشبیہ دیتے تھے۔ فارسی میں بھی زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے۔ مگر بھنورے اڑ گئے۔ اور اس کی جگہ مشک۔ بنفشہ سنبل ریحان آ گئے۔ جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے۔ اور زلف کو کوئلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام بدن اور میگھ بدن کہتے تھے اس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنبیلی بدن کہتے تھے اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حسن کی بہار دیتے ہیں۔ مگر چندر مکھ اور ماہ رخ مشترک ہے۔

آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور ممولے کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اردو میں آہوئے چشم رہے مگر ممولے ہوا ہو گئے۔ اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا آ گئی۔ جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی۔ بلکہ ترک چشم، شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے رفتار کے لئے بھاشا میں ہتنی اور ہنس کی چال عجب اٹکل ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اڑ گیا۔ فقط کبک دری، شور محشر اور فتنہ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے۔ . . . .

فارسی اور اردو کی انشاپردازی میں جو دشواری ہے۔ اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے۔ اس کی کیفیت ہمیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے۔ جو خاص اسی شے کے دیکھنے۔ سننے۔ سونگھنے۔ چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں۔ صاف اس کی برائی یا بھلائی نہیں دکھاتے۔ بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے۔ اس کے لوازمات کو شے اول پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے۔ جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حسن کا انداز دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول سے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اس رنگ میں شاعر کہتا ہے خواجہ وزیر۔

ہوں نہ بلبل جو کہے ذبح خفا ہو کر
روح میری گل عارض میں رہے بو ہو کر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر دور جا پڑیں۔ اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہوتی ہے۔ ان خیالی رنگینیوں اور جھوٹی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں، اور محسوسات میں عیاں ہیں، ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر وہ بھی عالم تصویر میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول اشیاء بے جان کو جاندار بلکہ انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں۔ ان کو بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل اوج اقبال سے سایہ ڈالے تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینے میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے۔ اور طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اول تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرضی ہے۔ اور وہ بھی اس ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے۔ وہاں ان کے فرضی ہما کا جانا دیکھئے۔ پھر زمین پر اس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسا دیکھئے۔ پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔ بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن خوش آوازوں کو سنتا ہے۔ یا جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے۔ انہیں کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشاپرداز ذرہ بگڑ جائے۔ تو زمین کے ساتھ پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں۔ اور دریا ان نار پتھروں سے ضمانت پینے لگیں:"

(مقدمہ آب حیات)

شیخ قلندر بخش جرأت کے متعلق بیان یہ ہے

"جرأت میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر تھے اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اول نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں۔ چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خان کے

۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی۔ حسن طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا۔

جرأت اب بندے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیمان کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے۔ "تا خدا نہ دہد سلیمان کے دہد"

میاں جرأت کے حال میں، بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات ہے تو یہ ہے کہ عین جوانی

میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں، کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا۔ مگر استاد مرحوم (یعنی حضرت ذوق) نے ایک دن فرمایا، کہ گیتی زمانہ کی دو آنکھیں ہیں: نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدر دانی سے دیکھا۔ بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی، اور ایک بدنما داغ ان کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں، کہ پہلے وہ اصل اندھے نہ تھے۔ بعض عزیز تو راوی ہیں کہ شوخی عمر کا سبب تھا۔ خود اندھے بنے۔ رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے۔ تفصیل اجمال یہ عبرت احوال: بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہے۔ دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی، قیامت آئی۔ دولت آئی، شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی لطیفہ گوئی، مسخرے پن کی حد سے گزری ہوئی تھی اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل سید انشا کلو اور ان کا یہ حال تھا، کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔

آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دوسرے دن دوسرے امیر آئے، سوار کیا، اور ساتھ لے گئے۔ ۴، ۵ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے، وہاں سے وہ لے گئے۔ جہاں جاتے، آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور لطیفے سنے۔ بہت خوش ہوئیں اور نواب صاحب سے کہا، کہ ہم بھی باتیں سنیں گے۔ گھر میں لا کر کھانا کھلاؤ، پردہ ہے، یا چلمنیں چھٹ گئیں، اندر وہ بیٹھیں۔ باہر یہ بیٹھے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بی بیوں کا برائے نام پردہ رہا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت آئی، کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا، نانا، کوئی ماموں، چچا بنتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دکھنے آئیں۔ چند روز ضعف۔ مگر بہانہ کر کے ظاہر کیا، کہ آنکھیں معذور ہو گئیں۔ مطلب یہ تھا، کہ اہل حسن کے دیدار سے آنکھیں سکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا؟ اور بھی قاعدہ ہے، کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں، نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دوپہر کو سو کر اٹھے، شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی۔ انہوں نے پھر پکارا۔ اس نے کہا، بیوی جائے ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا، کہ غیبانی دیوانی ہوئی ہے، سامنے تو رکھا ہے۔ وہی کیوں ہیں۔ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی، اور بولی، کہ اوئی بیوی، یہ موا کہتا ہے، کہ دو بندہ نہ دیکھتا ہے، یہ تو خاصا دیکھتا ہے۔ ما بھی میرے ساتھ یہ واردات گزری۔ اس وقت یہ راز کھلا۔ مگر اس میں شبہ نہیں، کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے۔

مزن فال بد کآورد حال بد
مبادا کسے کو زند فال بد

استاد ذوق کے متعلق آب حیات میں آزاد نے اپنی محبت و عقیدت کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

"ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق، جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا، تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی، اور رنگ سے بقائے دوام نے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا، کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا، کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں، کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے، کہ جس باغ کا یہ بلبل تھا، وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے، نہ ہم داستان رہے، نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا، وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں، جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں، وہ اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انہوں نے اور پانی سے نشوونما پائی ہے۔ وہ اور ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔ ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں، جی یہی چاہتا ہے، کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو، کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کار کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں، کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اس کی ہے، جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا، اور سب کچھ لکھوں گا، جو بات ان کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی۔ ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔" (آب حیات)

حالات ذوق کا ایک دلچسپ واقعہ ـــ آزاد کی زبانی۔

"ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے، ہر بیٹھ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے:

"شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت"

چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں، اور ان کے تنکے جو گرتے تھے، انہیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انہوں نے ہاتھ سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ انہوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا، تو ہنس کر کہا، کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا، ویران بولے، کہ جہاں سر پر قرآن بیٹھی استاد نے کہا کہ بیٹھے کیوں کر جانتی ہے، کہ یہ ملا ہے، حافظ ہے (الہی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ کی آیت پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا۔ بسم اللہ، اللہ اکبر کر دے گا دیوانہ ہے"

اُستاد ذوق کے کلام کے متعلق آزاد لکھتے ہیں

"ایک دن میں اور (عبداللہ خاں اوج) سے ملا۔ اور استاد کے مطلع کا ذکر آیا۔

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے۔ تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا۔

یاں جو برگ گل خورشید کا کھڑکا ہو جائے
دھول دستار فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا، مگر یہ فقرہ کہتے ہیں، کہ سحر ہو جائے۔ جو استاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں۔ مگر تامل کر کے میں نے کہا، کہ یہاں حقیقت میں پلٹ کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا، اور استعارہ میں لا کر میری طرف دیکھ کر ہنسے، اور کہا، کہ بھئی واہ! آخر شاگرد تھے ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں استاد مرحوم کی خدمت میں گیا۔ اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا: کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ لگا کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے، تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے۔ اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی، ہوئی، نہ ہوئی، نہ ہوئی۔ دو عاورات ہے۔ اب یہ ایک حسن اتفاق ہے، کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے، کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا خیر اگر یہ ہوا۔ تو کچھ علت ہی پیدا ہوا بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا، قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو، وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ مبتذل تھا، اب لطف متین اور شریفانہ ہے۔"

مندرجہ بالا عبارت کا آخری فقرہ علامہ آزاد کی انشا پردازی کا دلچسپ نمونہ ہے۔ ذوق کے حالات میں اور جگہ لکھتے ہیں۔

"عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلمیں حقے کی وہاں پیتے تھے۔ میں

چھٹی کے دن اس وقت چلا کرتا تھا، اور دن بھر یہیں رہتا تھا۔ مکان حضور دہلی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی لنگوٹی تھی۔ پاس ہی چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ فرماتے اجی ہمارا وہ شعر اس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے۔ ہاں اب اسے یوں بنا لو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پلنگڑے سے نکلے فرمایا، کہ کوئی ۳۵ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا، حضرت کیوں کر؟ فرمایا۔ ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے، اس میں مصرع تھا۔

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائے مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا۔ کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا، عرض کی حضرت پھر کیا؟ فرمایا!

"کھاتی ہے تین تین بل، اک گدگدی کے ساتھ" کمر کو اوپر ڈال دو، عرض کی۔ پھر وہ کیوں کمر؟ ۳۵ مصرع الٹ پلٹ کئے تھے، ایک اس وقت خیال میں ہے

دل ہے کمر کہ زلف مسلسل کہ پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ"

"نیرنگ خیال" علامہ آزاد کی فکر و خیال کی نیرنگیوں کا نادر نمونہ ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل میں تمہید کے طور پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات ہیں۔ اس میں مائتھالوجی کا ذکر ہے، جس پر مضامین نیرنگ خیال کی بنیاد ہے لکھتے ہیں۔

"فارسی اردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمر رواں یا آب گزراں کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسن عمر کو کاٹ رہا ہے۔ اور یہ بھی کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

اسی طرح غصے کے باب میں دیکھا ہوگا، کہ اسے آتش غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔۔۔ کبھی کہتے ہیں۔ کہ

"چو مار سیاہ برخود بپیچید"
اور کبھی جوش غضب کے لئے کہتے ہیں۔ کہ
"آتش از چشمش پرید"

"دود از نہادش بر آمد چو سپند از جا بر جست۔ پس انگریزی میں مائتھالوجی ایک خاص علم ہے۔ کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسم دیوی یا دیوتا مقرر کیا ہے۔ اور انہیں سامانوں سے سجایا ہے جو ان کے لئے لازم اور شایان شان ہیں۔ مثلاً

غصہ ایک عورت ہے کالا رنگ، ڈراؤنی صورت، تمام بدن پر بال کھڑے ہیں، جیسے لوہے کی سلاخیں، سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں، اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

عشق ایک موقع پر اسے نوجوان، خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے، اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے مگر آنکھوں سے اندھا کیا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے۔ کہ بھلائی برائی نہیں سوجھتی۔ کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے، اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑا ہوا ہے۔ کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے۔ اس کی پناہ نہیں۔

افواہ یا شہرت اس کی تصویر ایک بڑھیا عورت ہے۔ کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ جیسے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے۔ ساتھ ہی ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے۔ وہی عالم میں ایک ایک زبان پر آتی ہے۔

انگریزی میں انہیں گاڈ کہتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبۂ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ وغیرہ کے لئے مختلف گاڈ قرار دیئے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا۔ اس لئے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں۔ ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لئے ایک ایک دیوی دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے، کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں، اور اس کے صنائع بدائع پر نظر کریں۔ تو عقل حیران ہوتی ہے۔ کہ کون سا صانع ہوگا۔ جو ایسی دستکاری کر سکے پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو۔ اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور اس کے جزئیات دیکھو پھر جب دیکھتے ہیں کہ اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ یعنی ایک فاعل ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ تو ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کاموں کے لئے ایک ایک رب النوع فرض کیا جائے۔ جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو۔ اور سب کا مالک رب الارباب جامع جمیع صفات کمال۔ اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک فرشتہ موکل مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے، اور نہ وہی دیوی یا دیوتا۔ وہی گاڈ وہی رب النوع وہی فرشتہ موکل۔" ایک مضمون "سچ اور جھوٹ کا رزمنامہ" ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔

"حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔ سوانح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی، جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا۔

اوّل تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انہوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا۔ تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا۔ اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک ملعون بدکار تھا، کہ جہل تیرہ دماغ اس کا باپ تھا، اور وہم ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے۔ تو ان کی سنگت میں وہ بھی آ جاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا۔ اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا۔ کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا۔ اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔

ان واقعات میں کیفیات کی رنگینی اور رنگارنگی بہت ہے، لیکن بعض مضامین میں زیادہ جدت اور قدرت سے کام لیا گیا ہے چنانچہ ایک مضمون لکھا ہے۔

"انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے۔ کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں، اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں۔ تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالا لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے۔ تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔ میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا۔ اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا۔ کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے۔ کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں۔ اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا۔ اور اس تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے۔ اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے۔ لیکن جو بوجھ گرتا ہے۔ مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں

کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہوگیا۔

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرہ بھر ادل بہلایا بصورت بہلا دے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغہ میں ایک بھاری سی گٹھڑی لئے آتا ہے جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی، تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑتا آتا تھا۔ بدن سے پسینہ بہتا تھا۔ اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا۔ اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بُری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔ اس کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار دشوار تھا معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر درد و آہ کی گٹھڑیاں تھیں کہ انہیں میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزہ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ غریب مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے، کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے۔ لیکن تعجب یہ ہے، کہ جب اس انبار کے پاس آئے۔ تو ہمت نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جد و جہد سے سر ہلایا۔ مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے۔ اسی طرح چلے گئے۔ بہت بڑھیاں دیکھیں، کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں چند نوجوان اپنی کالی رنگت۔ کچھ موٹے موٹے ہونٹ۔ اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے۔ کہ جنہیں دیکھ کر شرم آتی تھی۔ . . . . . اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پروا۔ چلا آتا ہے۔ اس نے ایک گٹھڑی پھینک دی۔ مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا، کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے۔ مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے۔

ہم اس انبوہ پر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تک تک کر دیکھ رہے تھے۔ جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا، کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں۔ اپنے اپنے رنج و تکلیف کو تبدیل کریں۔ اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ . . . . .

چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں۔ وہ بیان کرتا ہوں، ایک پیر مرد کو نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا۔ درد قولنج سے جاں بلب تھا۔ لا ولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لئے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکور پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی داڑھی پکڑ لی۔ اور سر توڑنے کو تیار رہا۔ اتفاقاً جو اس لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا، کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ واسطے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجئے۔ اور اپنا لڑکا لیجئے۔ کہ پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ بدلا ہوا عذاب پھر نہ آسکتا تھا۔

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا، مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی۔ اور بائے بائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی۔ مگر اس کے ساتھ بے بدنامی کا داغ اور رسوائی کا ٹیکہ بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہوا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا، کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا، مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا یعنی جان سے بیزار تھے۔ اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر کے دوڑتے پھرتے تھے سارا میدان گریہ و زاری، نالہ و فریاد، آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بے کس آدم زاد کے حال درد ناک پر پھر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انہیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن سے اتار کر پھینک دیا۔"

ایک اور مضمون یعنی "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" میں بڑے لطف جدت قائم کی ہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی۔ کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا تھا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے کام اور بڑے سے بڑے کام جن سے ہوئے یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوئے لیکن میں اس دربار میں ان ہی لوگوں کو لاؤں گا جنہوں نے اپنی محنت ہائے عرق افشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیم کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا اس واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں"

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیرباد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نور نے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور یہ ہم پریوں کا شہرت دی کتاب سنگھاسن بتیسی جوان کے عہد میں تصنیف ہوئی اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالی داس شاعر تھا۔ جس نے اس کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاویدہ بخشی ہے۔

دفعتاً سکندر نے آواز دی کہ انہیں لاؤ۔ جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ حقیقی داڑھی کیساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا، سکندر خود اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا اپنے برابر کرسی پر بٹھایا۔ اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا۔ اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔ . . . . . اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا۔ جو اپنی وضع سے بے مدماتہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی۔ اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اسی کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جلد کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لئے درست بھی نہ ہوتا تھا جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی . . .

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ ایسی مرکب دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور ٹھہر ٹھہر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ بعض مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے۔"

محمد حسین آزاد کی سخندان فارس کے حصہ اول کے اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"میرے دوستو! تم حیران ہوگے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا، ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے حرف حرف کو الگ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت اس کی اصل کس کس قوم میں پہنچی آئی ہے۔ اس میں یہ رشتے ہیں اور کیا کیا وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں . . . ملک بہ ملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں؟ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی اصل پر غور کرتا ہے۔ ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے۔ اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری

زبان سے کن کن باتوں میں متعلق ہیں اور کونسی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں پھر ان سببوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں، اور یہ غیر منقطع کام ہے کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے کبھی تنزل میں مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے اور اس کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطالب کے لئے لکھتا ہوں۔ گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا یہاں پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے گرے کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی گلو پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جزو کا اس کا گلے پر قبضہ ہے۔ اسی لئے اس کا نام گریبان رکھا ہوگا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریوا انہی معنوں میں آیا ہے۔ اور بان سنسکرت میں وان ہے۔ ثابت ہو گیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں مر گیا وہاں جیتا ہے۔ کلابتوں کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں فلسفی زبان اس کا بل کھولتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ کلابہ کلاوہ رسوت کا لچھا، آلتوں ترکی میں سونے کو کہتے ہیں۔ یعنی سنہرا لچھا۔

(سخندان فارس حصہ اوّل صفحہ ۱۵، ۱۶)

ساتویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری کے درمیان ایرانی زبان پر جو دور گزرے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد "سخندان فارس" میں لکھتے ہیں۔

"سنہ ۶۹۹ھ میں عبداللہ وصاف ابن فضل اللہ نے غازی خان شاہزادہ چنگیزی کے لئے تاریخ وصاف لکھنی شروع کی حقیقت میں بڑا زور مارا ہے اور فارسی عربی ربانداں کا حق ادا کر دیا ہے مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی فارسی ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے استعارہ اور تشبیہ نظم میں سو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے نثر میں بہت کم تھے۔ انہوں نے اس قدر بہتات کی کہ مطلب گم ہو گیا عبارت کو مقفّٰی کیا اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا۔ ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں، کہیں کہیں سطریں آدھا صفحہ اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازان خان کی حکومت کنارۂ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ خاک عرب کا اثر ضرور ظاہر ہوتا تھا۔ ترکی الفاظ کیوں نہ آتے۔ ترک بچوں میں بیٹھ کر لکھتے تھے اور ترک بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے اور چونکہ فاضل تھے، صاحب زبان تھے، آمد طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے کہیں چھوٹے کہیں بڑے فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے۔ یہ سب دوستو ایسے انشا پرداز منہ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں بے ارادہ کسی منزل کے خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہ بھی بڑا کمال ہے ذرا سی بات کہ مکر سے لباد معاملہ کو، مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے، یا بازاری دکانداروں کی تعریف کو اس قدر لمبا اور چوڑا بغیر دودھ کے ابال اٹھانا ہے اور یہ ان ہی کا کام تھا مگر بے حاصل۔

ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر فوج عظیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جز اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا۔ اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک دونوں نے بڑا کمال کیا مگر اس قلعے کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے؟ اور جہاز میں کونسا لشکر سمندر پار اتر سکے؟"

درباراکبری میں بادشاہ اکبر کے ذاتی، درباری آئینی حالات اور سلطنت کے خاص ارکان اور وزراء و امرا کے حالات بڑی تفصیل اور مختلف تاریخوں سے یکجا کئے ہیں۔ اس کتاب کے چند مختصر اقتباس پیش ہیں۔

"محبت کے ناز و نیاز۔ اکبر بادشاہ قوم کا ترک مذہب کا مسلمان تھا، راجہ یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے۔ اتفاق اور اختلاف کے معنے تو ہزاروں تھے۔ مگر میں ان میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں۔ ذرا آپس کے برتاؤ دیکھو اور ان سے دلوں کے حال کا پتا لگاؤ۔ اس ہنگامے میں یعنی تیسری یلغار گجرات پر سارا جہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا) اکبر کے برابر نکلا اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا اس نے کہا کہ اس وقت یہی ہے۔ زرہ ڈیرے میں رہ گئی۔ دردخواہ بادشاہ نے اسی وقت بکتر اتروایا اور اپنے خاصے کی زرہ پہنوا دی۔ وہ سلام کر کے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن (مالدیو راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا کہ اس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا اس نے پوچھا بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سنایا۔ روپسی کی جودھپوریوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتر مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا تھا اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے۔ اس وقت بادشاہ کو یاد آیا کہ ان کی کھٹک ہے۔ فرمایا ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمہیں دے دی ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ روپسی کے دل نے نہ مانا اور تو کچھ نہ ہو سکا۔ اسلحہ جنگ اتار کر پھینک دیئے اور کہا خیر میں میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا جب ہمارے جاں نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہو سکتا کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان میں لڑیں، ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائیں گے۔ راجہ بھگوان داس اسی وقت گھوڑا اڑا کر جے مل کے پاس گئے۔ اسے سمجھایا کہ دنیا کے رستے کا نشیب و فراز دکھایا یہ بڈھا خاندان کا ستون تھا اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے شرمندہ ہو کر پھر ہتھیار سجے۔ راجہ بھگوان داس نے آکر عرض کی کہ حضور! روپسی نے بھنگ پی تھی۔ اس کی لہروں نے ترنگ دکھائی تھی اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر سن کر ہنسنے لگا اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہو کر اڑ گیا۔"

نمونہ از حال خان زمان علی خان شیبانی۔

"غرض رات نے صبح کی کروٹ لی۔ ستارہ نے آنکھ ماری اور شفق خونی بہار ابھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جا کر بہ آواز بلند چلایا کہ مستو! بے خبرو! کچھ خبر بھی ہے۔ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہنچے اور دریا بھی اتر آئے۔ اس وقت خان [illegible] کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر جانے کہ آصف خان کی چالاکی ہے۔ مجنوں خان قاقشال کو [illegible] سایہ بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پروا نہ کی۔ . . . غرض نور کا تڑکا تھا کہ بادشاہی نقارہ پر چوٹ پڑی۔ آواز سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کا بندوبست کرنے لگے۔

۹۷۴ھ نو بجے پیر کا دن، عید قربان کی پہلی تاریخ تھی، منگروال (سنگروال) علاقہ الہ آباد پر مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونوں بھائی شیر ببر کی طرح آئے اور اپنے اپنے پرے جما کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں خان زمان قائم ہوا ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھ کر فوج کے پرے باندھے۔ بادشاہ بال سندر ہاتھی پر سوار تھے اور مرزا عزیز کوکہ خواص میں بیٹھے تھے۔ ان کا خاندان گرد و پیش جما ہوا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ میدان کا رنگ بدلا۔ بہ نظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور بہادروں کو للکارا۔ اب دونوں بھائیوں (خان زمان اور بہادر خان) نے سمجھا کہ خود بادشاہ اس لشکر میں ہے۔ . . . . اب انہوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا اور جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہو گئے۔ مگر تنگ کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب رکھتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گر پڑا اور وہ پیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس حال کی خبر نہ ہوئی تھی۔ سب کو بدحواس دیکھ کر خود آگے بڑھا اور فوج داروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی صف کو علی قلی خاں کی فوج پر ریل دو کہ بہادر خاں

کو ادھر متوجہ ہونا پڑے۔ دونوں لشکر تہ و بالا ہو رہے تھے۔ علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ دونوں بھائیوں پہ کیا گزری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم ہوتی اور کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے بات یہ ہوئی کہ ادھر سے ہیرانند ہاتھی علی قلی خاں کی فوج پر جھکا۔ ادھر سے مقابلہ میں اودیانہ ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلّہ کی ٹکر ماری کر اودیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے ترکش کی طرح علی قلی خاں کے لگا۔ دلاور بڑی بے پروائی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا اور ایسا بے ڈھب لگا کہ ہرگز نہ سنبھل سکا گھوڑا اور سوار کو بھی لے کر گرا ہمراہیوں نے دوسرا گھوڑا اس لئے کیا اتنے عرصے میں کہ وہ سوار ہو ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہوا بلا کی طرح اس پر پہنچا۔ خان زمان نے آواز دی فوجدار ہاتھی کو روکنا۔ میں سپہ سالار ہوں، زندہ حضور میں لے جا کر بہت انعام پائے گا۔ اس کم بخت نے نہ سنا۔ ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خان زمان جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اڑتے تھے، اسے ہاتھی روند کر ہوا کی طرح نکل گیا اور وہ خاک پر بسکتا رہ گیا

اللہ اللہ! جس بہادر کو فتح و اقبال ہوا کے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر ٹہلاتے تھے وہ خاک پر پڑا دم توڑ رہا تھا۔ جوانی سرہانے کھڑی سر پیٹتی تھی اور سپاہ گری پائنتی زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے ہاں خان زمان! یہ جہاں کا عمومی قانون ہے تم نے ہزاروں کو خاک میں ملایا۔ آؤ بھائی اب تمہاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمہیں سونا ہوگا۔

سرِ لشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہو گیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر ادھر لگ دوڑ مار رہا تھا کہ لاتے ہیں نظر بہادر۔ بہادر خان کو اپنے آگے گھوڑے پر سوار کر کے لایا اور حضور میں پیش کیا انہوں نے پوچھا۔ بہادر میں! کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا اس نے کہا: الحمد للہ علی کل حال۔ بادشاہ کا دل بھر آیا بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا۔ پھر کہا: بہادر! با شما چہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر برروئے ما کشیدید؟ وہ شرمندہ و شرمسار سر جھکائے کھڑا، انتہا مارے خجالت کے کچھ جواب نہ دے سکا، کہا تو یہ کہا: الحمد للہ علی کل حال کہ در آخر عمر دیدار حضرت بادشاہ کہ ماحی گناہان است، نصیب شد۔ آفرین ہے اکبر کے حوصلے کو۔ گناہ بخش کا لفظ سنتے ہی آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا: بہ حفاظت نگہ دارند۔ اس نے پانی مانگا، اپنی چھاگل میں سے پانی دیا۔ . . . کوئی کہتا ہے بے اطلاع کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کنبوہ نے بے نصیب بہادر کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹا دیا مگر ملا صاحب کہتے ہیں کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے۔

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔ نمک حرام پکڑے آتے تھے اور مارے جاتے تھے بادشاہ کو بڑا خیال خان زمان کا تھا۔ جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے . . . حکم دیا کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لئے اشرفی، ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ ہائے کم بخت ہندوستانیو تمہارے سر کٹ کر بھی سستے رہے۔ لشکر کے لوگ بے سر و پا اٹھ دوڑے گودیں بھر بھر کر لاتے تھے اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے ہر سر کو دیکھتے تھے، دکھاتے تھے اور پہچانتے تھے۔ افسوس ان ہی سروں میں خان زمان کا سر بھی ملا کر ادبار کا سر ہو گیا۔ سبحان اللہ! جس سر سے تیغ کا نشان جدا نہ ہوتا تھا جس سے اقبال کا خود نہ اترتا تھا جس چہرے کو کامیابیوں کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی اس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں۔ نحوست نے خاک ڈالی تھی۔ کون پہچانے؟ سب کو تردد تھا۔ ارزانی مل اس کا ماہی اور معتبر دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا۔ بلایا اور دکھا کر پوچھا۔ اس نے سر کو اٹھا لیا۔ اپنے سر پہ دے مارا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ خواجہ دولت کہ پہلے اس کے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا وہاں سے آ کر حضور میں ملازم اور پھر دولت خان ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا اور کہا: مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان بائیں طرف سے کھایا کرتا تھا۔ اس لئے ادھر کے دانت رنگین ہو گئے تھے۔ سو دیکھا تو ایسا ہی تھا . . . .

جب اکبر کو یقین ہو گیا کہ خان زمان کا کام بھی تمام ہوا، تو گھوڑے سے اتر کر خاک پر پیشانی کو رکھ دیا اور سجدہ شکر بجا لایا . . . . خان زماں! واہ رے تیرا دبدبا! مرد ہو تو ایسا ہو۔ آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے تیری لاش اس سے بھی سوا خراب و خوار ہوتی۔ مگر آقا کی جاں نثاری میں ہوتی تو آب زر سے لکھی جاتی۔ خدا حاسدوں کا منہ کالا کرے، جنہوں نے دونوں بھائیوں کی سنہری سرخ روئی کو روسیاہی کر دیا۔ آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بد اعمال حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ رکھا۔ یہ نااہل خود کچھ نہیں کر سکتے۔ اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور منصوبے باندھتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں۔ خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا۔ اپنے تئیں خدا کے اور انہیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان کے اعمال ہی ان کو سمجھا لیتے ہیں۔

مکتوباتِ آزاد

آزاد کے تقریباً جس قدر بھی خطوط دستیاب ہو سکے ہیں ان میں اکثریت ایسے مکتوبات کی ہے جو انہوں نے میجر ڈاکٹر سید حسن بلگرامی جو کہ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے بھائی تھے کو لکھے ہیں۔ یہ صاحب فوج میں ڈاکٹر تھے اور بعد ازاں امرتسر میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ ان خطوط کی اشاعت پہلی بار [illegible]ء میں مخزن رسالہ میں ہوئی اور پھر کتابی صورت میں چھپے اس کتاب کا دیباچہ سید جالب دہلوی نے لکھا۔ لکھتے ہیں۔

"مکتوبات آزاد کے ذریعہ سے رسالہ مخزن نے نہ صرف مولانا کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک دل آویز نمونہ شائقین اردو کو دکھایا ہے۔ بلکہ بالواسطہ ان کی پرحوادث گرفتہ زندگی کے حالات کا وہ دلچسپ حصہ بہم پہنچایا ہے جس کا مہیا ہونا خود حضرت آزاد سے بھی شاید بحالات موجودہ دشوار تھا۔"

اب ایک خط آزاد کا پورے کا پورا نقل کیا جاتا ہے۔ یہ خط آزاد نے اس عرصہ میں لکھا تھا جب وہ دربار اکبری لکھ رہے تھے۔ اس کتاب کو سر سالار جنگ اوّل کے نام سے معنون کرنا چاہتے ہیں۔ خط یہ ہے۔

"عالی جناب من دام اجلالکم! تسلیم! عنایت نامہ باعث اعزاز ہوا۔ رات کو دس بجے میں گھر پہنچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے۔ "دربار" بیچ میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے مجھے کہاں! یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ "ماثر الامرا" اور "سوانح اکبری" کسی زمانہ میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگا تھا۔ ادھر میں بھاگا گیا۔ اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا۔ اور یادداشتیں لیتا گیا۔ "ماثر الامرا" بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ جمع کیا ہے وہ ماثر الامرا سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گزرنا کفر ہے ہر شخص کے حال میں دو دو تین تین چار چار نکتے نکل گئے اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو "دربار اکبری" کا مشاہدہ کریگا یہ نہ سمجھے گا کہ آزاد کو ماثر ہاتھ میں نہیں آئی۔

دونوں صورتوں کی تفصیل آپ اب پوچھتے ہیں؟ افسوس دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے۔ وہ صورتیں یہ کہ ایک تو وہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ چھپے

ممدوح کو بھیجا۔ اور استمزاج کیا۔ ممدوح نے منظور فرمایا۔ مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینہ خیال میں ایک تصویر موہوم ہے اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ خلاصہ قلم بند تو کرتا ہوں۔ دیکھوں کچھ رنگ دیتا ہے یا نہیں۔

اس کا مضمون یوں تصور فرمائیے کہ جب اس موقع پر آپ رنگ اپنی دستکاری صرح کر چکے تو عالم بالا کے پاک نہاد زمین پر اترے۔ دسوں عقلیں پانچوں حواس غور، فکر وہم، خیال، غیرہ وغیرہ سے انجمن معتقد موئی، مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے۔ سب نے دور بینیں، شش اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی۔ مگر وہ ایوان عالی شان وغیرہ وغیرہ۔ وہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو۔ ایسی جسارت زیبا نہیں۔ آزاد نے کہا سحر کا نور، شفق کی سرخی صبح کا عالم حسن نظر آتا ہے، اہل دل کہتے ہیں سبحان اللہ! صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں۔ دل کہتا ہے صل علیٰ اس میں آفتاب سے اجازت۔ اور اس میں خسرو گل سے استمزاج کون کرتا ہے۔ میں نے ایسا ممدوح پایا۔ اس کے دامن اقبال سے وابستہ کیا۔ وغیرہ وغیرہ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب غائبانہ عرض کرتا ہوں کہ وغیرہ وغیرہ۔ میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے اور اس میں کچھ حرج نہیں۔

(۲۶ ستمبر ۱۸۸۲ء، از محمد حسین عفی عنہ، آزاد لاہور مستی دروازہ)

ایک اور خط میں سید حسن صاحب کو لکھتے ہیں۔

"جناب من! تسلیم! آپ دیکھتے ہیں کہ علم کی چڑیل یونیورسٹی پنجاب! تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی۔ چند مہینے میں سن لیجیے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لیے ہم پکڑے جاتے ہیں۔

کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی ہوتا ہے۔ کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی، خواہ سررشتہ تعلیم میں، خواہ سول لائن میں۔ غیر ورجہ پنشن کا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ۱۵۰ روپے مہینہ آتا ہے۔ اس میں ۵۰ روپے آئیں گے تو صورت حال کیا ہوگی۔ لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو۔ تھوڑا کھاؤ۔ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزار ہاتھ ہیں۔ عہدہ کے لیے کوشش کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

(۳ فروری ۱۸۸۳ء)

میرے بارے میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، دل کو نہایت تشفی اور استقلال حاصل ہوا ہے۔ اپنے جد کے خانہ زادوں کی دستگیری آپ صاحب نہ فرمائیں گے تو اور کون ہے۔ پروردگار عالم اس خاندان کو اقتدار روز افزوں عطا فرمائے۔ میں نے اپنے دل سے یہ قرار دے لیا ہے کہ اگر اکسٹرا اسسٹنٹی دی تو اختیار کر لوں گا ورنہ پنشن لوں گا تھوڑے پہ قناعت کروں گا۔ اپنی کتابوں کو پوری کوشش سے تیار کر کے پیش کش کرتا رہوں گا اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا۔ ہاں جو خدمت فرمائیں گے وہ بھی بجا لاؤں گا۔ کالج کا تغیر نہیں بھی ہوتا تو یہ سمجھ لیجیے کہ میں تو اب آپ صاحبوں کا ہو چکا ہوں

تم سنو یا نہ سنو، نالہ کیے جاؤں گا
درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو
حشر پر وعدہ دیدار ہے میں ڈرتا ہوں
پھر نہ ہو دے گی رخ یار ادھر ہو کہ نہ ہو

(۱۰ فروری ۱۸۸۳ء)

ملازمت کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈالتے ہیں۔ یہ ہے کیا؟ مجھے آپ کے جد کی سرکار سے ہے۔ حضرت! غلام آزاد کو آزاد کر کے وہ دست بردار نہ ہوگی۔ انشاءاللہ آپ دیکھیں گے۔ اس سے بہتر صورت ہوگی اور بہت جلد بہتر ہوگی۔۔۔۔ خوشا بحال آزاد کہ ۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے تو سر بسجدہ شکر خدا کا بجا لائے گا۔ اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
آنچہ ما در کار داریم، اکثرے در کار نیست

آہا۔ پھر انشاءاللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگی طبع کے ساتھ تصنیفات کو درست کروں؟

(۲۰ اپریل ۱۸۸۹ء)

"میرا حال یہ ہے کہ ڈاکٹر لٹنر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم کے بموجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے گی۔ گویا اس تاریخ سے میں ان کے ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت! یا نصیب!

(۲۶ جولائی ۱۸۸۹ء)

"مگر شورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا وہی ڈیڈیکیشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجاؤں یا اسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثہ جانکاہ پر عالم نے نالہ و زاری کے معمولی حق ادا کیے، اور یادگار کے لیے تاریخیں اور نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہو سکا یہ کتاب ان کے نام پر لکھتا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی۔

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے ان کے سامنے پڑھتا اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وہ کیا فرماتے ہیں۔ ہائے سرسالار جنگ! سارے ارمان دل کے دل میں رہ گئے۔ ہائے سرسالار جنگ! مولیٰ اعلیٰ اللہ القاب حاضر ناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ آپ سے اپنا کیا حال کہوں۔ میرا دل کچھ اور دل ہے

(۲۰ مارچ ۱۸۸۶ء)

"آپ انہیں پھر لکھ دیجیے گا کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم کی منظور کی ہوئی ہیں خدا گواہ ہے۔ مجھے ان سے غائبانہ عشق تھا، پہلے کہتا تو خوشامد تھی اب تو خاص ان کے اور میرے درمیان معاملہ ہے دیکھیے آج لوح روحانی پر ان کا خیال کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی باتیں قابل یقین ہرگز نہیں، لیکن اس سے میں نے ایک بہلاوا اپنے دل کا کر رکھا ہے۔ رات کو ایک بجے دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور یہ یقین آپ کریں کہ جا بجا نے زمان اخوان الشیاطین جو زندہ ہیں۔ ان سے تو ان کی باتیں بہر حال بہتر ہیں۔

بسکہ از برخورد عالم عکس مطلب دیدہ ام
میرم از آب ولا آئینہ پنہاں می شوم

(۱۵ مئی ۱۸۸۵ء)

فلسفہ الٰہیات یہ آزاد کے وہ جذبات ہیں جو انہوں نے حالت جذب و مستی میں تحریر کیے یہ عالمانہ خیالات فارسی، عربی اور سنسکرت سے ماخوذ ہیں ان تحریروں میں آزاد کا انداز بھی آسمانی ہے۔ حالت جنون میں لکھی گئی ان تحریروں کے بارے میں ان کے نبیرے آغا محمد طاہر لکھتے ہیں۔

"جب مشاغل سے فارغ ہوتے تو جس طرح زبانوں کے کھوج لگاتے ہیں اسی طرح روحانی فلسفہ کے سراغ کے درپے ہوتے اور مختلف ممالک کے فلسفوں کو بڑی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست کرتے چنانچہ اس بات کا کچھ ثبوت ناظرین کو اسی کتاب میں ملے گا مگر یہ باتیں اکثر اکیلے میں ہوتیں اور خاص اپنی ذات کے لیے مخصوص تھیں اور دل سے ان کا کچھ واسطہ نہیں۔ ایک دفعہ ایک تختی ملے جو شاید اب بھی طبق ہو۔

وہ روحوں کو ملاتی تھی، روحیں سوالات کا جواب پنسل سے لکھ دیتی تھیں مگر یہ بہت ابتدائی باتیں ہیں کچھ دنوں بعد اسے پھینک دیا اور بغیر کسی خارجی مدد کے خود فرماتے کہ فلاں کی یا فلاں جگہ کی روح آئی ہے، پہلے خود سوال کرتے، پھر تھوڑی دیر خاموش رہتے۔ بعد ازاں تعجب کے لہجہ میں اس بات کا جواب دیتے اور کہتے "اچھا تو یوں ہے؟ معلوم ہوتا تھا۔ یا دل و دماغ میں ان ہی تو نکات اتر رہا ہے جس کو یہ اپنے دل و دماغ کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ کسی اور قوت کا اثر سمجھتے ہیں مگر یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار تھے۔ احباب و آشنا سے ملتے تھے سارے کام حسب معمول کرتے تھے۔ بایں ہمہ طبیعت میں ایک لگن سی پیدا ہو چلی تھی۔ اور اکثر اوقات تنہائی میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی حال میں ۱۸۸۵ء کے آخر میں ایران کا سفر کیا۔ جہاں سے واپس آکر "سخندان فارس" مکمل کیا، سفر نامہ اور لغت کا مسودہ بنا کر لائے۔ یہ سب چیزیں تو دنیا والوں اور اہل ملک کے لئے تھیں۔ اپنے لئے جو کچھ لائے وہ دماغ میں محفوظ تھا پھر کالج میں آکر لیکچر دینے لگے۔ . . . . ظاہر میں یہ سب کچھ تھا لیکن باطن میں دوسرا رنگ غالب آتا جاتا تھا۔ اس دوران مولانا کی ایک بھتیجی اور لاڈوں کی پالی خاص بیٹی کا انتقال ہو گیا جو بقول مولانا ان کے علمی مشاغل میں ان کی مشیر اور دست راست تھی۔ اس واقعہ نے قلب پر بہت اثر کیا اور اس دنیا سے جی بالکل اچاٹ ہو گیا۔ . . . .

آخر کار وہ دن آگیا جبکہ ساغر دل مختلف قسم کی شرابوں سے سرتاپا معمور ہو گیا۔ پیمانہ بھر چکا تھا چھلکنے کی دیر تھی سو اس کے لئے ایک بہانہ مل گیا۔ قدرت نے وہ سامان بھی پیدا کر دیا۔ ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ لاہور میں ایک درویش سید وحیان شاہ چشتی تشریف لائے جو کبھی سالک تھے اور کبھی مجذوب۔ . . . . مولانا کو بھی تقدیر ادھر لے گئی۔ بعد چندے راز و نیاز کی مجلسیں گرم ہونے لگیں۔ تخلیہ کی ان صحبتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا بہت جلد ظہور میں آگیا کہ مولانا باایں علم و فضل دیوانگی و وارفتگی کے بھروش ہو کر محبت کے کوچہ و بازار میں رسوائی کا تمغہ لگائے، پریشانی کا پٹکا باندھے، جذب کامل کا علم ہاتھ میں لئے با آواز بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے مارے مارے پھریں۔

اگرتی کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹا تیرا میلا ہو کر

ایک دن مولانا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے نوں کوٹ (سید صاحب کی جائے قیام) چلے گئے، ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سید صاحب، (سید وحیان شاہ چشتی) نے نظر اٹھا کر دیکھا، مسکرائے اور فرمایا —— "جا محمد حسین جا تیرے لئے دلی کا حکم آیا ہے۔ دلی چلا جا۔" خدا جانے اس نگاہ میں کیا جادو تھا، اور اس ایک فقرہ میں کیا تاثیر تھی، جس نے آزاد کو اپنا اسیر بنا لیا۔" . . . . الغرض بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید والی بات ہو گئی۔ حضرت آزاد اس حالت میں اسی وقت پیدل دلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ . . . دلی پہنچے مگر عجیب شان سے، ننگے سر، پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد، حال حیران پریشان، آناً فاناً میں تمام دلی میں شور مچ گیا۔ [illegible] منت سماجت کرتے کہ ہمارے غریب خانہ چلئے مگر یہاں کون سنتا تھا کبھی قدم شریف کبھی استاد ذوق کی قبر، کبھی شہر کبھی جنگل، جہاں مستوں کا من کہتا وہیں جاتے اور دن گزرتے۔ . . . . آخر دلی سے خبر آئی تو والد ماجد مرحوم دلی گئے۔ ڈھونڈا، بہت کچھ سمجھایا، ایک نہ مانی۔ . . . اس عرصہ میں جذبہ سکون کی طرف مائل ہو چلا تھا۔ ان کے بچپن کے دوست شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب مرحوم منا پرچا کر اپنے دولت خانہ پر لے آئے تقریباً ایک سال تک مہمان رکھا، اور وہ ناز برداریاں کیں کہ اس زمانہ کی دوستی اور محبت ان پر قربان ہے۔ خود اور سارا گھر گویا ان کے حکم کے پابند تھے۔ اس عرصہ میں طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا تھا اور سید وحیان شاہ والی کیفیت ہو گئی تھی، کبھی سالک تھے کبھی مجذوب۔ چنانچہ والد صاحب دہلی گئے اور اپنے ساتھ لے آئے۔ اب مولانا اپنے علیحدہ مکان میں رہنے لگے۔ آس پاس الماریوں میں کتب خانہ سجا دیا۔ درمیان میں پلنگ، ایک گوشہ میں چھوٹا سا بوریا، اس پر فرش، کاغذ، قلم دوات، سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتے۔ صبح و شام وہی پیتے۔ چار پانچ میل سیر کو جنگل باغوں میں جاتے۔ جہاں ہر پتا ان کا مخاطب تھا ہر درخت ان سے بات کرتا تھا، نسیم کا ہر جھونکا ان کے لئے نئی خبریں لاتا تھا۔ پھولوں کی خوشبو خدا جانے کس کا پتہ دیتی تھی غرض کہ صبح و شام کی تفریح ان کی زندگی تھی۔ راہ میں کوئی ملتا اور سلام کرتا تو جواب دیتے اور کھڑے ہو کر اس کیلئے دعا کرتے اور روانہ ہو جاتے۔ دونوں وقت گھر پر کھانا کھاتے۔ آم اور تربوز سے بہت رغبت تھی۔ . . . یہ تمام کیفیات گویا مولانا کی ذہنیت ابتدائی مراحل سے لے کر انتہائی معراج تک کی ایک مجمل مگر سبق آموز تاریخ ہے ——"

سید جالب دہلوی مکتوبات آزاد کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"مولانائے موصوف نے سن رشید و تمیز کو پہنچتے ہی عملی فوائد پر خیالی محبوبیوں کو ترجیح دینی شروع کر دی تھی۔ اور اوائل شباب ہی میں اپنی طبیعت کا یہ نرالا رنگ معاصرین و احباب پر ظاہر فرما دیا تھا۔ اور بیس بائیس سال کی عمر میں قدامت پرستی کو کھلم کھلا اپنا شعار خاص قرار دے لیا تھا نیز صوفیائے کرام کے معتقدات میں جن دو عالموں جسمانی و روحانی یا سفلی و علوی کا الگ الگ آباد ہونا مذکور ہے ان کی دید بھال اپنے لئے ضروری ٹھہرائی تھی۔ اور اپنے اوقات گرامی کا ایک حصہ روحانیت پر غور کرنے اور دونوں عالموں کے ظاہری و باطنی تعلقات کا پتہ لگانے کے لئے مختص کر رکھا تھا اور ویدانت اور تصوف میں جو ریاضتیں تزکیہ نفس و تصفیہ باطن کے لئے مقرر ہیں وہ مہنتوں اور درویشوں کی صحبتوں میں رہ کر سیکھی تھیں۔ متعدد اشغال و اذکار کو اپنا لازمہ زندگی بنا لیا تھا اور ذکر خفی و جلی اور ورد نادِ علی میں وہ مشق بہم پہنچائی تھی کہ آپ کے سانس کی حرکات بعض اوقات پاس بیٹھنے والوں کو چونکا دیتی تھیں۔ . . . .

ایک طرف تو یہ خیالات تھے جنہوں نے سالہا سال کی پختگی سے عقائد کا درجہ حاصل کر لیا تھا دوسری جانب وجہ معاش میں بھی آپ کو تحقیق و تعلیم السنہ ہی سے واسطہ پڑتا تھا اور اس کام میں جو تین زبانیں فارسی، اردو اور ہندی آپ کا سرمایہ افتخار تھیں ان کے ادب کا دار و مدار صرف شاعری پر آکر ٹھہرتا تھا اس لئے آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی۔ اور شعرائے ہند و فارس کے نتائج و افکار ہر وقت آپ کے انیس خلوت ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کوئی محل تعجب نہیں کہ جب ارباب زمانہ کی ناقدری و بے وفائی اور دنیائے دنی کے مصائب و آلام کا ساکنان عالم خیال کی دلجوئی و مداوات سے مقابلہ پیش آیا تو آخر الامر طمانیت و یکسوئی کا گلزار سراپا بہار دکھا کر اور سالہا سال بے غل و غش اس میں سیر کرنے کی امید دلا کر حضرت آزاد کی طبیعت کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گیا اور مولائے موصوف جملہ تعلقات دنیاوی سے منہ موڑ کر اور عقل و خرد کے ساتھ ملکی لٹریچر کو روتا چھوڑ کر یہ شعر پڑھتے ہوئے وید تصور کے گلشن بے خزاں میں پہنچے۔

نز ہشیاران عالم ہر کہ را دیدم غمے دارد
دلا، دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمے دارد

خمخانۂ جاوید (تذکرہ شعراء) میں آزاد کی اس حالت جذب و مستی کے بارے میں لکھا ہے

"سائے میاں ماسٹر پیارے لال صاحب فرماتے ہیں کہ جنون کے شروع میں ایک دن آزاد مجھ سے ملنے آئے اور تقریباً ڈھائی دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ مگر ان الفاظ کے بجز اور کچھ زبان پر نہیں لائے کہ لالہ صاحب! آپ اس شعر کو پڑھا کیجئے اور اس کے معنی آپ جو چاہیں سمجھ لیں:

پردہ در کعبہ سے اٹھا دینا ہے آساں
پر پردۂ رخسار صنم اٹھ نہیں سکتا"

اب مولوی آزاد کی اس تصنیف کی طرف آتے ہیں جو انہوں نے جذب و مستی اور حالت جنون میں لکھی یعنی فلسفۂ الٰہیات ۔۔۔۔ بقول حامد حسن قادری صاحب "فلسفۂ الٰہیات کو غور سے پڑھا جائے تو آزاد کی بے ربطی اجزائے حواس میں بھی ایک قسم کی شیرازہ بندی نظر آتی ہے۔ زبان اور طرز بیان سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو مضمون موضوع کی صحیح ترتیب ہوش و حواس کا پتا دیتی ہے۔ ابتداء میں تمہید ہے۔ اس کے بعد سات باب ہیں، جن کا نام ملاپ رکھا ہے۔ ہر ملاپ کا ایک عنوان ہے۔ کہیں عنوان کے نیچے موضوع باب کی تفصیل بھی لکھ دی ہے۔ پہلا ملاپ اس طرح ہے:

"پہلا ملاپ (اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جنہیں ہم دیکھتے ہیں اور وہ ہیں، اور سوچتے ہیں اور پاتے ہیں کہ ہیں)

پہلے ان میں مادہ ہے۔ وہ ہے، اور وہ معدوم نہیں ہوتا، اسے کیسا ہی رگڑ ڈالو کاٹ کر جا ہو کہ وہ ایسا ہو کر کچھ اب نہیں رہا، یہ نہ ہوگا ایسا وہ رہ رہ مہین ہو کر عالم اور آفاق میں پھیلا ہوا اڑ رہا ہے کہ کہیں معلوم نہیں ہوتا اور وہ ہے، وہ کیا ہے؟ وہ ہیولیٰ۔ اس کے ریزے ایسے ننھے ننھے تیس ہیں کہ کسی قوت حسی سے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کو بھی چاہیں تو ایک کو دو اور دو کو چار کر ڈالیں۔ تو وہ رہیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ کہیں اب معدوم ہو گئے۔ اس کو ہم نے عرب میں کہا کہ ہر جزو متجزی ہے۔ جزو لا یتجزی محال ہے۔ اچھا تم ایک جزو لا یتجزی لاؤ ہم دوسرا ویسا ہی اور لیں گے، اور دو کو ملائیں گے، اور ایک تیسرا ویسا ہی اور بے کسان دو کے اوپر رکھ دیں گے۔ ان دو کی درز جہاں ملی ہوئی ہے، اوپر والے کی کسی جگہ پر ہوگی۔ وہیں سے کاٹو اور دونوں ٹکڑے موجود ہیں پھر جا ہو تو پھر اسی طرح کاٹ لو، اور کاٹتے چلے جاؤ۔ معدوم نہ ہوں گے۔ اچھا تم عمیق میں خیال کر کے تحلیل کرو۔ وہ نہ رہے گا اور صورت میں ظاہر ہوگا معدوم نہ ہوگا۔ دھواں ہو جائے گا ہوا ہو گا۔ نظر نہ آئے گا، پر ہوگا۔"

"حرکت اسے نہیں کہتے کہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے مسافت طے ہوئی یا پرندہ اڑا، اور بلند ہوا یا درخت اگا اور بڑھتا چلا گیا اور اسی طرح برعکس حرکت ایک امر ہے معنوی کہ اندر ہے۔ وہ ظہور میں آتا ہے۔ تب حرکت اس کی معلوم ہوتی ہے ارسطو نے اسے اور طرح بیان کیا ہے اور عرب نے لیا ہے۔ حرکت کو جب ہم سوچتے ہیں تو وہ ایک محرک کی محتاج ہے ہر وقت، اسی واسطے ہم اپنے ہر حرکت کے لئے ارادہ کو ضروری جانتے ہیں، اور یہ ان باتوں میں ہے جو اپنے اختیار میں ہیں۔ جو اپنے اختیار میں نہیں اور اپنے میں نہیں ان میں جو حرکت ہو حرکت بالغیر کہیں گے۔ محرک جب غیر ہو اور محسوس ہو تو قاسر ہے۔ اور نہیں تو قدرۃ الٰہی ہے وہ اگر عادۃ میں نہیں ہے تو الٰہی ہے اور نہیں تو طبعی ہے۔ ہم طبعی کو نہیں لیتے اور قسری کو بھی نہیں لیتے۔ ارادی کو لیتے ہیں۔

ارادی حرکت ہماری دنیا کے کاموں میں ہمیشہ غیروں کی معاونت کو دیکھتی ہے۔ کچھ بھی نہیں تو روپیہ اور پانی، اور ہوا، سردی میں گرمی، گرمی میں سردی، یہ ضروریات تو بہت محتاج الیہ ہیں کہ بے ان کے گزارہ نہیں۔ ہم اپنی ارادی حرکت میں ایسے ایسے غیروں کے محتاج ہیں اگر ہم ایشور کی طرف متوجہ ہوں، تو ہمارے کام ہمارے اختیار میں ہوں، اور پھر جب ہم ایک طرف ہوں تو ایشور کی طرف ہوں۔ اس وقت جانو کہ ہماری ارادی حرکت کدھر کو ہونی چاہیے۔ بس وہ ارادہ ایشور کی طرف ہو۔ اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہیئے۔"

اضطراب جنون کے بعد تحریر میں لٹک زیادہ ہو گئی ہے اور زیادہ بہک گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہیے۔ ہم ہوں ادھر اور ادھر، اور ادھر وہ مقام نہیں معلوم ہوتا کہ ایشور کس درجہ سے دیا فرماتے ہیں۔ ہم کو ادھر کا دھیان اور ان کا دھیان ادھر کا دھیان اور ان کا دھیان، ادھر کا دھیان اور ان کا دھیان باندھنا چاہیئے۔ ادھر اور ادھر وہ مقام پھر معلوم نہیں کہ کس لفظ سے مری نشان کی دیا شروع ہوتی ہے مگر ہوتی ہے اور اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ ہوتی ہے وہ ہوگا تو ہو گی اور رہو گی۔ اور ہو گی۔"

آگے چل کر اپنے آپ کو ایشور کا اوتار تصور کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"ہم ہیں اپنے کام میں۔ تم ہوئے ناکام۔ دیکھو یہ ہے۔ ہمارا کام۔ ہم ہیں کہ کرتے ہیں پورا فلسفۂ الٰہی کر اور دیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ مٹتے ہم سری ہمارا جے چند ہوتے ہم پروفیسر آزاد"

کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"ہم نے پتا کا جا پیارا بقول آزاد راہ آگاہی کو یہاں ختم کیا۔ دیکھو سری جے چند تو ہے راجوں کا راجہ۔ ہمارا جہ یہ ہم نے کیا ہے تجھ کو آج ہے تو ایسا۔ جو حکم ہم دیتے ہیں تو جاری کرتا ہے۔ وہی ہوتا ہے آج سے چار ہزار برس بعد تو ہوگا پروفیسر آزاد اسی کتاب کو تو لکھے گا اپنی زبان سے۔

اسے اردو کہیں گے۔ اردو تیسرا لشکر ہے۔ زبان کا نام یہ ہوگا۔ ہم نے جو کچھ بتایا ہے وہی تو نے لکھا ہے۔ ہم اس وقت ان سب کو ظہور دیں گے۔ پھر بھی کافر ایسے ہوں گے کہ ہماری قدرۃ کو نہ مانیں گے . . . . . اب ہم تجھے کہتے ہیں، تو ہے پروفیسر آزاد۔ لکھ تو اپنی طرف سے سری مہاراج میں کیا عرض کروں جو حضور سے ارشاد ہو رہی ہو۔ اچھا ہم کہتے ہیں اے میرے ایشور تو نے کہا تو نے لکھوایا۔ مجھ میں کیا طاقت ہے تو نے کہا بس میں نے کہا بس یہی خاتمہ ہو گیا زبان پر پروفیسر آزاد لکھ آج ہے ۲۲، کو بدی ۱۸۵۵ء جنوری کی چھٹی تاریخ ۱۸۹۶ء . . . . . "

مولوی ذکاء اللہ

مولوی ذکاء اللہ کی ولادت دہلی میں ۱۸۳۲ء میں ہوئی ان کے والد صاحب کا نام ثناء اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم دہلی کالج میں حاصل کی یہاں ان کی ملاقات مولوی محمد حسین آزاد اور نذیر احمد ڈپٹی سے ہو گئی۔ اسی کالج سے ان تینوں مشاہیر ادب کی دوستی شروع ہوئی جو آگے چل کر آخر عمر تک قائم رہی۔ ذکاء اللہ صاحب بہترین ریاضی دان تھے۔ انہیں بچپن ہی سے ریاضی سے بڑی دلچسپی تھی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دہلی کالج میں ہی ریاضی پڑھانے لگے۔ بعد میں آگرہ کالج گئے۔ یہاں سات برس تک اردو اور فارسی کا درس دیتے رہے۔ کچھ عرصہ ڈپٹی انسپکٹر سکولز بھی رہے ۱۸۶۶ء میں دہلی کے نارمل سکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ تین برس یہاں ہیڈ ماسٹری کی اور پھر الہ آباد کے میور سنٹرل کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ آخر عمر تک اسی کالج میں پڑھاتے رہے اور پنشن لی۔ اس کے بعد خانہ نشین ہو گئے۔ اور باقی ساری زندگی گھر بیٹھے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہے۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں دہلی میں انتقال کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے

اپنی ایک کتاب "سیر المصنفین" میں جو تذکرہ ہے مولوی ذکاء اللہ کے بارے میں لکھا ہے۔

"بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی جو پرانی یونیورسٹیاں آج تک پیدا نہ کر سکیں آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے تو میں انہیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجہ تکمیل پہنچ کر ان جیسے عالم پیدا کرے گی۔ کریم النفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ، متنوع معلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہ عامہ خلق، فیاض طبع، برٹش گورنمنٹ کے قدر شناس اور دوست، حنفی، راسخ الاعتقاد، صلح کل، مرنجان مرنج۔ مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط و ضبط بچپن سے شروع ہوا، جبکہ وہ دہلی کالج یادش بخیر کی عالی جماعت میں تھے، اور میں عربی میں۔ بایں ہمہ ہم ریاضیات میں ہم سبق تھے۔ ماسٹر رام چندر کے شاگرد۔ مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت ریاضیات کے ساتھ خداداد مناسبت تھی اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش رہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے اور چونکہ ماسٹر صاحب نے بڑے بڑے جاتکوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا، ماسٹر صاحب کی ہمہ وقت کی ہم نشینی کے شبہ سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب کی طرف سے متہم بھی کرتے تھے۔ لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے بڑا مداح اور قائل ہوں۔ ان کے معاصر جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، اکثر مر چکے ہیں۔ ایک میں گراں جان کی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو رہا ہوں لیکن تاہم کہ میں اب بھی گواہی دیتا ہوں۔ اور مر کر بھی خدا کے حضور گواہی دوں گا کہ جہاں تک آدمی کو آدمی کے بطون کا علم ہو سکتا ہے، میرے علم میں مولوی ذکاء اللہ پکے موحد تھے ایک طرف ایک خدا کے قائل ہیں مولوی ذکاء اللہ کی جس ادا کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتا رہا۔ وہ یہ تھی کہ حسد ان کو چھو تک نہیں گیا تھا وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے۔ انہوں نے ساری عمر جو عمر طبعی سے متجاوز ہوئی طالب علمی میں صرف کی اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی۔ وہ علم کو علم ہی کے لیے حاصل کرتے رہے یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذات تھا۔ نہ ان عالموں کی طرح سے جو علم پر متفرق ہوئے ہیں۔ انہوں نے مدرسے سے نکل کر نوکری کی حالت میں، اور نوکری بھی سررشتہ تعلیم کی نوکری، از خود انگریزی کا شوق کیا اور اپنے مطالعہ سے اس استعداد کو اس درجہ تک پہنچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے ہچکچاتے تھے۔ مگر ان کی ہر طرح کی معلومات، جو انہوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھیں اتنی وسیع تھیں کہ بی اے اور ایم اے کو نصیب نہیں ہوتی۔

مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی ضخیم کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب لکھنے کے لئے فرصت کیسے پاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی ایک ادا اور جس میں وہ منفرد تھے ان کی مستقل مزاجی تھی کہ انہوں نے انگریزی کے اتنے تجربے پر سال برابر اپنی وضع نہیں بدلی، اور وہ باوجودیکہ سید احمد خاں کے گویا پٹھو تھے مگر انہوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی نہیں اوڑھی، انگریزی جوتی تک نہیں پہنی، ہیں جاڑے کے دنوں میں ان کو لوئی جسے پہننے کی طرح کارچوبی کُرتا، پاجامہ پہنے رکھتا اور ہُما کر بہ غرض مولوی ذکاء اللہ کی وضع ظاہری طرز ماندو بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی اس کو چھو کر بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو نہ ہیا وہ بھی یقیناً مسلمان تھے۔ مگر ان کا دامن عقیدت لوث تعصب سے بالکل پاک تھا، وہ اجی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ سب سے خلوص کے ساتھ ملتے اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے۔ یہ ان کے خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتے دم تک مولوی ذکاء اللہ اور سکرات کی سی بے قراری پادری صاحب کو تھی یعنی ریورنڈ جی الف ایچ ریو۔ کہ بظاہر دونوں میں کسی ایک کی کوئی غرض بنیادی دوسرے سے متعلق نہ تھی، مگر دونوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا اور ان کی باہمی دوستی اور محبت الحب للہ کی قسم سے تھی۔"

مولوی ذکاء اللہ کی تصنیفات

مولوی صاحب کو شروع ہی سے ریاضی سے بہت دلچسپی تھی۔ سکول اور کالج میں بھی ریاضیات ہی ان کا پسندیدہ موضوع رہا۔ بعد ازاں انہوں نے دینی علوم ادبی مسائل اور تاریخ پر بھی بہت کچھ پڑھا اور تعلیم و تدریس کو بھی اپنے حیطہ تحریر میں لائے۔ ریاضیات پر کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے طبیعات پر بھی کتابیں تصنیف کیں، جو نصاب تعلیم میں شامل کی گئیں۔ انہیں سرکار نے پندرہ سو روپے انعام بھی دیا اور خان بہادر و شمس العلماء کے خطابات سے بھی سرفراز کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس قدر عدیم الفرصتی میں اتنی زیادہ تعداد میں کتابیں کس طرح سے تصنیف کیں۔ "سیر المصنفین" کے حوالے سے اگر ہم بات کریں تو مولوی ذکاء اللہ کی کتابوں کی تعداد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کوئی تین سو کے قریب جا پہنچتی ہے۔ درسی کتابوں کے علاوہ ان کی کتاب تاریخ ہندوستان اٹھارہ حصوں میں جا کر مکمل ہوئی علاوہ ازیں انہوں نے سوانح حیات پر بھی کتابیں تصنیف کیں جبکہ اس سے پہلے ہمیں سوانح نگاری پر اس اسلوب کی کتابیں نہیں ملتیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب اس وقت کے مختلف رسالوں میں بھی مضامین لکھتے تھے اور ان مضامین کی تعداد بھی بے شمار ہے۔ جن رسالوں میں مولوی صاحب مضامین لکھتے رہے ان میں تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، مخزن لاہور، زمانہ کانپور، رسالہ حسن حیدرآباد اور شمس کلکتہ شامل ہیں۔ میسور کے رسالہ صبح بہار میں بھی ان کے بعض مضامین لگاتار شائع ہوتے رہے۔

مولوی ذکاء اللہ کا مکان کوچہ چیلان میں تھا اس مکان میں وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اپنے گھر کے ایک کمرے میں وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے ساتھیوں میں سے کسی نے بھی اتنی زیادہ تعداد میں اور اتنی ضخیم کتابیں نہیں لکھیں۔ مولوی صاحب کے ساتھ یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہوئی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھیوں کی تخلیقات کو تو پذیرائی ملتی گئی مگر مولوی صاحب کی کتابیں گوشہ گمنامی میں جا پڑیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درسی کتابیں تو انگریزی ذریعہ تعلیم بننے کے بعد اپنے آپ گمنامی میں چلی گئیں جو سوانح عمریاں انہوں نے ملکہ وکٹوریہ وغیرہ پر لکھی تھیں وہ انگریزوں کی بساط حکومت الٹنے کے بعد ختم ہو گئیں، اور پھر انگریزی زبان میں اس سے زیادہ معلومات والی سوانح عمریاں مل جاتی تھیں۔ ان کی جو کتاب بہت قدر کی تھی یعنی تاریخ ہندوستان جو اٹھارہ جلدوں میں تھی، وہ محض اپنی طوالت کی وجہ سے عامۃ الناس میں مقبول نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ ان کتابوں کے گوشہ گمنامی میں چلے جانے کی یہ بھی ہے کہ یہ کتابیں بڑے معمولی کاغذ پر چھپی تھیں جو زمانے کے گرم و سرد تھپیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ آج ان کے چند ایک مضمون ضرور درسی کتابوں میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔

انداز نگارش

مولوی ذکاء اللہ بنیادی طور پر ایک زاہد خشک اور ریاضی دان تھے۔ تحقیق و تدقیق ان کا خاص اور من پسند موضوع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیقی کتابوں میں ہمیں ان کے انداز بیان کا جوش ملتا ہے۔ جب کہ دوسری کتابوں میں ان کا انداز تحریر الجھا ہوا اور خشک ہے۔ ہاں تجزیہ اور تفصیل ان کے ہاں پوری طرح ملتی ہے۔ اکثر تحریروں کو پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے جیسے کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر کے بیان کر رہے ہیں۔ ذاتی کوشش اور ٹھساگیری الا تخلیقی جوہر نہیں ملتا۔

البتہ تاریخ ہندوستان لکھتے وقت ان کے جوہر کھلے اور یہ کتابیں انہوں نے بڑی محنت اور کاوش کے بعد تحریر کیں۔ وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

"میرا اعتقاد ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لئے وہ تواریخ لیتا ہوں جن کے مؤلف عہد نویس ہوں اور وہ سب سے زیادہ معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہوں۔ ان سے تاریخی حالات اخذ کر کے لکھتا ہوں اور پھر انگریزی تاریخوں سے جن کا ایک انبار میرے پاس موجود

ہے۔ بعض مضامین التقاطاً کہہ کے لکھتا ہوں۔ (تاریخ ہندوستان۔ جلد ہفتم)

تاریخ ہندوستان ساتویں جلد میں ظفر نامہ شاہجہان میں رانا اودے پور سے شاہی لڑائیوں کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

"رانا کا حال ایسا تنگ کیا، کہ وہ ایک لحظہ کسی مقام میں آرام نہیں کر سکتا تھا، سورج مل اس کے بیٹے کے ساتھ اہل و عیال اس کے جا بجا پڑے پھرتے تھے۔ خود تھوڑے آدمیوں کے ساتھ سرگرداں تھا۔ اور برسات کے موسم کا انتظار کرتا تھا کہ وہ راہوں اور گزرگاہوں کو پانی سے گھیر لے۔ اور مجھے دشمنوں کی آگ سے بچا دے۔

سلطان خرم نے کوہستان کی تنگ ناؤں میں تھانے بٹھا دیئے تھے، کہ جہاں رانا کی خبر پائیں۔ وہاں فوراً اس کے پکڑنے کو لشکر روانہ ہو۔ محمود شاہ کو کانگڑہ کے بت خانوں کی تخریب اور راجپوتوں کی تادیب کے لئے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی تاراج شروع کی، اور بہت آدمیوں کو مارا، اور قید کیا۔ رائے سندر داس سروہی کی طرف گیا، وہاں رانا کے اہل و عیال کا نشان اس کو بتایا تھا، مگر اس کے پہنچنے سے پہلے چترمان رانا اہل و عیال کو کسی دوسری جگہ لے گیا تھا۔ اس سرزمین میں رائے سندر داس نے قتل و غارت اور اسیر کرنے اور منازل ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بت خانوں پر راجپوت بڑے دلیرانہ لڑے۔ اور آخر کو جوہر کر کے مع اہل و عیال مرے۔ اس رانا نے بادشاہ کے حقوق کا پاس کیا، اور اپنے آئین و کیش کا کچھ خیال نہ کیا، بتوں کو جلایا اور بت خانوں کو ڈھایا۔

بدل ہا چناں مہر او خانہ ساخت
کہ ہندو بہ تخریب بت خانہ ساخت

اس حسن خدمات کے صلہ میں رائے سندر داس کو رائے رایاں کا خطاب ملا، اور رفتہ رفتہ اس کا درجہ ایسا بڑھا کہ راجہ بکرماجیت کا خطاب مرحمت ہوا جس سے بڑھ کر راجاؤں کے واسطے کوئی خطاب نہیں۔"

شاہ جہاں کے متعلق لکھتے ہیں "جب شاہ جہاں نے تخت شاہی پر جلوس کیا تو اس کو مراسم سنت مصطفوی و شریعت محمدی کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا، بہت پاس و لحاظ تھا، کہ اول حکم اس نے یہ دیا کہ سجدہ کہ جس کی تعظیم کا معبود حقیقی سزاوار ہے، اب آئندہ کوئی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاک مذلت پہ نہ رکھے۔ یعنی عہد اکبری میں بادشاہ کو جو سجدہ کرنے کا دستور تھا وہ موقوف کیا۔ مہابت خاں خانخاناں نے معروض کیا، کہ جہاں آفرین نے نظام عالم کے لئے اپنے بندوں کو مرتبۂ نوازش و بزرگ داشت میں متفاوت پیدا کیا ہے۔ ایک کو اوج عزت و رفعت عنایت کیا، اور مرتبہ والا اختیار بزرگواری اور پایہ بلند فرماں گزاری پر پہنچایا، اور مسند کامگاری و بختیاری پر متمکن کیا، اور دوسرے کو حکم پذیری اور فرماں برداری کے لئے پیدا کیا، اور ہر ایک کو استعداد کار کے اندازہ اور حالت روزگار کے موافق اس کے امور ضروریہ کے اہتمام میں ممد و معاون بنایا، اگر حضرت کو پرہیزگاری اور احکام الٰہی کی اطاعت کے سبب سے سجدہ ناپسند ہے۔ تو اس کی جگہ زمین بوس مقرر کیا جائے جس سے مخدوم خادم ہیں اور رئیس مرؤس ہیں۔ اور سلطان و رعیت میں استقامت اور جمہور کے لئے امتیاز ہو۔ بادشاہ دین پناہ نے اس کی ملتمس کو منظور کیا۔ اور یہ قرار دیا، کہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کے پشت دست پر بوسہ دیں، اس کا نام زمین بوس رکھا گیا۔ مگر اس میں بھی سجدہ کے ساتھ مشابہت ہوتی تھی۔ اس کو بھی موقوف کر کے تسلیم چہارم مقرر کی جس کا نام آگے آئے گا، اور سادات کو کہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔ اور فضلاء صلاح آثار اور درویشان پرہیزگار اور زاویہ نشان عبادت گزار کو اس زمین بوسی سے معاف کیا، اور یہ مقرر کیا، کہ جس وقت بادشاہ سے ملاقات ہو، تو السلام علیکم کہیں۔ اور جب رخصت ہوں، تو فاتحہ پڑھیں۔

وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات کے متعلق تاریخ عہد انگلشیہ میں بیان کرتے ہیں۔

"اس نے اپنی سرکار کی خیر خواہی اور خیر اندیشی میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، مگر اس میں اس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا۔ تو اس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا، از راہ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا۔ اہل انگلستان نے اس کو بے سر و سامانی سمجھا، اس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا، اور مروت و فتوت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا، مگر ضرورت بود روا باشد پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے سبب سے برخود غلط اتنا تھا، کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا، ہر کام اس کا ایک راز سربستہ اور سر پوشیدہ تھا، کسی کام کی اصل حقیقت کھلنے ہی نہیں دیتا تھا، کہ اس کے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہ ہو۔ وجہ اس کی یہ تھی، کہ وہ ہر کام کو بڑے ہیچ پاچ سے کرتا تھا، غرض اس میں جو خوبیاں تھیں۔ وہ تحسین کے قابل تھیں۔ اور جو برائیاں تھیں۔ وہ نفرین کے لائق یوں سمجھنا چاہیئے، کہ رعایا پروری سپاہ کی دلداری، لوگوں کو اپنا کر لینا، رفاہیت عباد اور معموری بلاد کا خیال۔ یہ سب خوبیاں اس میں ایسی تھیں کہ وہ ایک طوطی خوش رنگ کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں، مگر اپنی سرکار کی تنگ نشاہی کے سبب سے اس کی گنجینہ آمائی، دولت افزائی ایک ایسی بلی اس میں تھی، کہ وہ اس طوطی خوش رنگ کو نوچ کھاتی تھی، مگر اس بلی کے بھنبھوڑنے کے لئے اس کے پاس ایک کتا بھی موجود تھا جو اس کی خود پرستی و خود رائی تھی، بالغرض یہ فضائل اور رذائل اس میں وہ کام کر رہے تھے جو ایک بڑے بند مکان میں طوطی اور بلی اور کتا کام کریں؟"

سر سید کی طرح مولوی ذکاء اللہ نے بھی مختلف ضروری موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے ہیں، ہر مضمون اس قدر صحت فکر، قوت استدلال اور تفصیل و تشریح کے ساتھ لکھا ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ چند مضامین کے مختصر اقتباسات درج ہیں۔

"الف۔ ادب۔ ادب کے معنی اس ریاضت محمودہ اور کوشش و سعی کے ہیں، جس سے کسب فضیلت ہو، ہر چیز کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعلیم کو بھی ادب کہتے ہیں تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا کرنے لوگ اسے دیکھ کر باادب ہو جائیں۔ جو ادب سیکھنے کا ذوق رکھتا ہے، اور بے ادبوں کو اپنا معلم سا بنا لیتا ہے۔ جیسے آہو سے وحشی جو گھر میں رانہ کھاتا ہے۔ وہ اور آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو بنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے۔ اس کا فکر استاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے، تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو۔ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے، کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے ہودہ جس کو مزاح کہتے ہیں۔ وہ خردمندوں کے نزدیک بد سلاح ہے۔ اگر تمہاری داڑھی کوے کے پروں کی سی سیاہ ہو، تو بڈھوں کی بگلا کی سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض و رگل عذار ہو۔ تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے نہ چڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ ایک زنگی پر ہنسا تو زنگی نے جواب دیا کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے، اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔"

یہ عبارت ایسی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اخلاق کی کسی فارسی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو۔

"ب۔ کتب کا مطالعہ۔

مطالعہ تنہائی اور عزلت میں خوشی بخشتا ہے۔ گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا ہے معاملات کے فیصلہ اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھاتا ہے۔ بس مطالعہ سے حسن بیان اور قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات مقدمات کو تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، مگر مقدمات منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاح کی تدابیر جیسی چاہیئے، عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔ تم اس واسطے مت پڑھو کر لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کریں گے یا ہم خود بہت باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصود اعظم یہ ہو کر ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی ان پر عمل کریں گے۔

بعض کتابوں کا صرف مزہ چکھا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض بالکل نگل جاتی ہیں یعنی کل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں یعنی اول سے آخر تک بڑی توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب سے جو کتابیں بنتی ہیں ان کا حال آب مقطر کا سا ہے۔

نمونہ از مضمون "آگ":

"اللہ جل شانہ نے اپنی مخلوق میں اپنی صفت کی نشانیاں عجب حیرت انگیز انداز سے دکھائی ہیں کہ انسان ان نشانیوں کو ذی شان سمجھ کر اپنا معبود بنا لیتا ہے حقیقت تک عدم رسائی کی وجہ سے مجاز میں بالکل محو ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ازلی الہٰی کتاب میں آگ (اگنی) کا بیان دیکھو تو تم کو معلوم ہو گا کہ وہ ایک نشان کبریائی دکھا رہی ہے معبود بنی بیٹھی ہے آدمیوں کو اپنا بندہ بنا کر پوجا کرا رہی ہے۔ ہمہ دانی کی صفت سے اس کی ذات موصوف ہو رہی ہے۔ (یہ وہ حقیقت ہے کہ اللہ ہی کی ذات سے مخصوص ہے) اس کی ذات کی نسبت وہ نکتے بیان ہو رہے ہیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ذہانت کی ضرورت ہے۔

یہ مثل کہ آگ میں مو تو یا مسلمان ہو، ایسے محل پر بولی جاتی ہے جہاں ہر طرح سے کام کرنے میں برائی ہی برائی ہو۔ آگ ہندوؤں کی معبود ہے اگر اس میں مرتے تو نرک میں پڑے، مسلمان ہو تو جہنم میں جائے۔ دونوں طرح سے خرابی ہی خرابی ہے۔ آگ ہندوؤں کی ازلی معبود ہے۔

زردشتیوں کی کتابوں میں آگ نور الہٰی کا ظہور دکھا رہی ہے۔ آدمیوں کے سر کو اپنے آگے سجدہ میں جھکا رہی ہے۔ اپنی پرستش کے لئے آتشکدے بنوا رہی ہے۔ جو بجنسہ درخشاں و تاباں نظر آ رہی ہے۔ . . . . ارسطاطالیس نے استقرا سے اربعہ بسائط عنصریہ، خاک، باد، آب، آتش، قرار دیئے، مگر عناصر کو بسیط حالت میں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ آتش حالت بسیط میں زمین معدوم اور کرۂ نار میں موجود۔ انسان کرۂ نار میں پہنچ کر کیوں کر دیکھ سکتا ہے۔ خاک حالت بسیط میں زمین کے طبقۂ اولیٰ اور طبقۂ طینیہ کے نیچے بیٹھی ہے تحت الثریٰ میں جا کر اس کی زیارت ہو سکتی ہے جو انسان کے لئے ناممکن ہے ہوا بسیط حالت میں کرۂ ہوا کے طبقۂ سیوم میں موجود ہے۔ انسان اگر پر لگا کے جائے تو اس کی قدم بوسی کر سکتا ہے مگر یہ بھی ممکن نہیں۔ پانی تو کسی حالت بسیط میں مل ہی نہیں سکتا ارسطو کے نزدیک ان چاروں عنصروں کا ہیولا ایک ہی ہے۔ مگر محققین زمانہ حال آگ کو ہیولیٰ سے خالی جانتے ہیں، اور اس کو مادی نہیں مانتے حرکت سے کہتے ہیں کہ حرارت پیدا ہوتی ہے آگ بھی اس حرارت کی کیفیت ہے۔ ان مباحث میں ہنگامہ سخن گرم کرنے سے مجھے اندیشہ ہے کہ قلم دیاسلائی بن کر میرے ہاتھ کو نہ جلا دے۔

آگ عجب نابکار اولاد ہے، پیدا ہوتے ہی ماں باپوں کو کھا جاتی ہے جن لکڑیوں کی زناشوئی سے پیدا ہوتی ہے، انہیں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے اور آپ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے۔ آگ ہماری دشمن جانسوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی۔ وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے۔ مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لئے ہماری رنج و تکلیف کے دور کرنے کے لئے آسائش و آرام کے واسطے، صدہا ضروریات زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔ ہمارے چولہے پر ماما گری کرتی ہے اپلے کنڈے جلا کر روٹی اور کھانا پکاتی ہے۔ آگ ہی نے انسان کو پکانا سکھایا ہے جس کے سبب سے وہ اور حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے جیسا انسان حیوان ناطق کہلاتا ہے ایسا ہی پزندہ حیوان ہے کیونکہ کوئی حیوان اپنی ہنڈیا پکانے کے لئے آگ پر نہیں چڑھاتا مگر حضرت انسان ہی عقل کے پورے ہیں کہ پھونک پھونک کر آگ روشن کرتے ہیں اور اپنی خوراک پکاتے ہیں اور اس کی دھوئیں سے آنکھوں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ . . .

جن ملکوں میں سردی کی شدت ہے اور برف کثرت سے پڑتی ہے، وہاں بغیر آگ اور ایندھن کے آدمی کا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ . . . انگلستان ایک سرد ملک ہے اس کے اندر ہر گھر میں ایک آتشدان ہوتا ہے جس کے گرد گھر والے آگ تاپتے ہیں بڑے چھوٹوں کو طرح طرح کے سبق سکھاتے ہیں۔ وہ بچپنے کی ادن کے ساتھ ایسے بنے جاتے ہیں کہ بڑھاپے تک ان کے تار و پود ٹوٹتے نہیں، دلوں پر وہ نقش جماتے ہیں کہ عمر کی درازی ان کو مٹا نہیں سکتی۔ وہ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ اقتدار زمانہ ان پر زنگ نہیں چڑھا سکتا۔ یونیورسٹی کے آنرز پانے والے بہت تھوڑے آدمی ہوتے ہیں، مگر آتشدان کے گریجویٹ سب ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں جو علم تحصیل ہوتا ہے وہ ایک مدت کے بعد حافظہ میں پژمردہ و مردہ ہو جاتا ہے مگر ان آتشدانوں کے گرد کا سبق پڑھا ہوا ہمیشہ زندہ رہتا ہے —— جاڑے کے موسم میں ہندوستان میں دیہات میں صبح و شام ہر ہات کو دیکھو کہ ایک الاؤ جلتا ہے، جس کے گرد گنوار حلقہ باندھ کر خشک زمین پر اکڑوں بیٹھے ہیں۔ اور چلم میں بہت سی آگ بھر کر حقہ کی نے دوسرے منہ کی طرف کر دیتے ہیں، اس وقت وہ اپنی اولاد کے بیاہ شادی کرنے کی، گائے بھینس کے بیانے کی، بھیڑ بکری کے پالنے اور کھیتی کے بگڑنے سنورنے کی باتیں کرتے ہیں وہ عجیب دلچسپ اور دلربا ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ان کو سنے تو اس کو وہ علم حاصل ہو جو کبھی کتابوں سے نہیں حاصل ہو سکتا۔

اب تک ہم نے آگ کی دوستی کا بیان کیا اب اس کی دشمنی کا ذکر سنو کہ جب یہ مادر مہربان ہم سے خفا ہوتی ہے تو خدا کی پناہ! اس کے آتش ناک غصہ کے سامنے ساری مخلوق بھاگتی ہے۔ مگر وہ بھلا کب اس کو چھوڑتی ہے۔ اس طرح پکڑ لیتی ہے جیسے بھاگے ہوئے لشکر کو دشمن پکڑ لیتا ہے۔ اور فنا کر دیتا ہے۔ جس چیز کو چھوتی ہے چاٹ کر سیاہ کر دیتی ہے۔ کھیتوں کو اس طرح کاٹتی ہے جیسے کہ نائی قینچی سے داڑھیوں کو تراشتا ہے۔ جب درختوں کی رگڑ سے وہ پیدا ہوتی ہے تو جنگل کے جنگل جلا کر سیاہ کر دیتی ہے۔ اور جب وہ بھڑکتی ہے اور اپنے شعلے ہوا میں اڑاتی ہے تو سمندروں کی لہروں کی کیفیت دکھاتی ہے۔ سمندر میں بھی وہ فاسفورس کی روشنی کے جلوے خوب دکھاتی ہے۔ جہاں آگ ہو کر گھٹ جاتی ہے وہ جگہ دھواں دھار ہو کر تاریک ہو جاتی ہے۔ وہ دھوئیں کا تاج سر پہ لگا کر اور شعلوں کے بال بنا کے تاریکی کو دور کرتی ہے۔ غرض آگ بھی عجیب چیز ہے کہ زمین پر نار ہے آفتاب میں نور ہے۔ آسمان پر بجلی ہے۔ لوہے اور چقماق میں شعلہ ہے۔ گرم ملک والوں نے جو جہنم بنایا ہے اس میں وہ گنہگاروں کی تعزیر کے لئے ایک سخت عذاب ہے۔ سرد ملک والوں نے جو جنت بنائی ہے اس میں نکوکاروں کے

تاپنے اور آرام کرنے کے لئے جاں فزا ہے۔"

خدانخواستہ اگر آتش دنیا سے معدوم ہو جائے تو بہت سے کام ویسے کے ٹھنڈے ہو جائیں۔ نہ چولہے گرم ہوں نہ پتھر کر جوڑے نہ ریت سے منہ دیکھنے کا شیشہ بنے۔ غرض عالم کے حسن کے بڑے حصے میں گرما گرمی اور رونق نہ رہے اس کا جوبن خاک میں مل جائے، اس کی بہار پر خزاں آجائے۔ آگ اپنے تئیں کھاتی ہے اگر اس کو کوئی چیز کھانے کو نہ ملے۔ "آب و آتش ماچہ آشنائی۔" آگ پانی کو بخارات بنا کر اڑا دیتی ہے اس طرح اپنے دل کا بخار نکالتی ہے خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے، اس لئے کہ یہ عنصر انساں کے کاموں میں ہمیشہ کام آئے ہوا کو اس کا خدمت گار مقرر کر دیا!

ڈپٹی نذیر احمد

پروفیسر سلیم اختر اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور کے صفحہ ۱۸۱ پر لکھتے ہیں۔

"مولانا نذیر احمد نے معمولی حیثیت سے ترقی کی، اتنی کہ حیدر آباد دکن میں سترہ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے مگر کنجوس ہی نہ تھے بلکہ سود خور بھی تھے اور نہ صرف اچھا سمجھتے تھے بلکہ مذہبی جواز بھی پیش کرتے تھے۔ یہ تضاد ان کی ادبی زندگی میں بھی ملے گا گو وہ خود [illegible] کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر اردو کے پہلے ناول نگار بھی قرار پاتے ہیں، سرسید کے عاشق تو تھے لیکن شبلی اور حالی کی طرح ان کے لئے قلمی کام کے علاوہ دوسرے عملی کام نہ کئے۔ سرسید کے بیٹے محمود کی مانند بعض نقادوں کا اب بھی یہی خیال ہے نذیر احمد نے ابن الوقت میں در حقیقت سرسید ہی کا خاکہ اڑایا ہے نذیر احمد نے اس کی تردید کی تھی۔"

یہ ہمارے جدید نقاد کی جرأت مندانہ رائے ہے شمس العلماء مولانا ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں تنقید قدیم ان کے بارے میں کیا کہتی ہے اس کا جائزہ ہم آگے چل کر اسی تبصرے میں لیں گے۔ مولوی نذیر احمد ۱۸۳۲ء میں ضلع بجنور کی تحصیل نگینہ کے ایک موضع ریڑھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی اپنے والد مولوی سعادت علی کے ساتھ بجنور آگئے عربی فارسی نذیر احمد نے اپنے والد ہی سے پڑھی جو عربی فارسی کے عالم تھے اور شاہ عبدالغفور اعظم پوری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ سولہ سترہ برس کے تھے کہ والدین کے ساتھ دہلی آگئے اور یہاں مسجد اورنگ آبادی کے مدرسہ میں پڑھنے لگے یہاں انہیں بڑی مشقت بھی کرنی پڑتی تھی چنانچہ ان دنوں کے احوال مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی زبان سے یوں لکھے ہیں کہ۔

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی۔ کسی نے تیسی کی کڑی ہی رکھ دی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخا دیا غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے قدم رکھا، ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی، نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی ..... بہر حال لاچار مجھے روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی!"

تعلیم

۱۸۴۵ء میں مولوی نذیر احمد دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ ان کے کالج میں داخل ہونے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ دہلی کالج میں جلسہ تقسیم اسناد کی تقریب تھی کہ مولوی نذیر احمد بھی وہاں پہنچ گئے۔ بھیڑ کی وجہ سے گر پڑے اور انہیں چوٹ لگ گئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کالج کے پرنسپل نے انہیں گرتا دیکھ لیا انہیں اٹھا کر شفقت کا برتاؤ کیا اور سوال جواب کئے کہ وہ کہاں پڑھتا ہے مولوی نذیر احمد نے بڑے دلچسپ طور میں جواب دیئے اور کہا کہ میں ابوالفضل اور شرح ملا پڑھتا ہوں۔ پرنسپل نے امتحان لیا۔ مولوی نذیر احمد پاس ہوئے اور یوں انہیں کالج میں داخل کرنے کے بعد چار روپے ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا بعد میں یہ وظیفہ ۲۵ روپے تک بڑھ گیا دہلی کالج میں ان دنوں بڑے بڑے مشاہیر زیر تعلیم تھے۔ ان میں مولوی ذکاء اللہ بھی تھے۔ کالج کی تعلیم سے انہیں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بس اس خیال سے کالج جایا کرتے کہ انہیں وظیفے کی رقم ماہوار ملتی رہے۔

کچھ دنوں بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا سات آٹھ برس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کالج کو چھوڑ دیا۔ ان کی شادی مولوی عبدالخالق صاحب کی پوتی سے ہوئی۔ بعد میں ایک اور شادی ہوئی مگر اس کا نتیجہ خوشگوار نہ نکلا اور بیوی کو طلاق دینی پڑی۔

۱۸۵۴ء میں کنجاہ (گجرات میں) پولیس میں بھرتی ہو کر تعینات ہوئے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور آگئے۔ ایک انگریز افسر سے ناچاقی کی وجہ سے نوکری چھوڑ دی۔ غدر میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں لیکن اتفاق سے ایک روز انہیں ایک انگریز عورت زخمی حالت میں مل گئی یہ اسے اٹھا کر گھر لے آئے اور چھپ کر اس کا علاج کرتے رہے۔ تندرست ہو جانے کے بعد اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ غدر فرو ہوا تو اس خدمت کے عوض انہیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس (الہ آباد میں) مقرر کر دیا گیا۔

الہ آباد میں وہ منشی عبداللہ خاں امین عدالت کے گھر رہتے تھے ان سے انہوں نے انگریزی سیکھی اور اس میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ تعزیرات ہند کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا اور کانپور کے تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنا دیئے گئے مولوی نذیر احمد نے انہی دنوں علم ہیئت کی ایک کتاب کا اردو میں سماوات کے نام سے ترجمہ کیا اور اس کا ایک نسخہ سر سالار جنگ کو بھجوا دیا۔ اس کتاب سے متاثر ہو کر سر سالار جنگ نے نذیر احمد کو حیدر آباد بلا لیا یہاں انہیں ایک ہزار روپیہ تنخواہ پر ملازم رکھ لیا گیا یہاں ان کا قیام نواب محسن الملک کے پاس تھا یہاں ترقی کرتے کرتے بورڈ آف ریونیو کے ممبر بن گئے سر سالار جنگ کے بیٹے لائق علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بھی ان دنوں مولوی نذیر احمد سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔

سر سالار جنگ کی وفات کے بعد نذیر احمد دہلی آگئے۔ اور اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے کام میں لگا دیا۔ ان ہی دنوں انہوں نے توبۃ النصوح اور مرآۃ العروس دو ناول لکھے جن پر انہیں سرکار کی طرف سے ایک ہزار روپے کا انعام اور شمس العلماء کا خطاب بھی ملا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی نے انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ پنجاب یونیورسٹی نے بھی انہیں ڈی او ایل کی ڈگری دی۔

نذیر احمد کی ابتدائی زندگی بڑی غربت اور جدوجہد میں گزری تھی جس کی وجہ سے وہ پیسے کی بڑی قدر کرنے لگے تھے لوگوں کو سود پر روپیہ قرض بھی دیتے تھے اور اپنی کتاب "الحقوق و الفرائض" میں سود کو جائز قرار دینے کی بھی کوشش کی ہے۔

لطیفے

ایک بار سر سالار جنگ ثانی نواب لائق علی خاں بہادر شملے سے علی گڑھ جا رہے تھے کہ مولوی نذیر احمد سے غازی آباد کے سٹیشن پر ملاقات ہو گئی خاں بہادر نے باتوں ہی باتوں میں کہا کہ آپ حیدر آباد سے کیوں آگئے چلئے حیدر آباد کو واپس چلیں۔ مولوی نذیر احمد نے کہا۔ "نمک خوار سرکار ہوں، معافی چاہتا ہوں۔ اب جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں۔ ایک مرتبہ حیدر آباد سے پنشن پر نکالا گیا ہوں ڈر ہے اب کے گیا تو کہیں پنشن بھی نہ کھو آؤں۔"

ایک بار انگریز ڈپٹی کمشنر نے جو مولوی نذیر احمد کی علمیت اور سوشل پوزیشن سے واقف نہ تھا انہیں بلوانے کے لئے فہرست میں ان کا نام بھی عام لوگوں کے ساتھ شامل کر دیا۔ مولوی نے فہرست کے حاشیے پر یہ لکھ کر فہرست واپس کر دی کہ "اگر یہ سرکاری طلبی ہے تو سمن یا وارنٹ آنا چاہیئے دوستانہ بلاوا ہے تو چٹھی آنی چاہیئے اور یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں اور آنا نہ آنا میری مرضی پر منحصر ہے تو میں نہیں آؤں گا!"

ایک بار دہلی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کر رہے تھے۔ اس اثنا میں ہندوستانی افواج کے کمانڈر ان چیف بھی وہاں آئے تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مولوی

نذیر احمد نے کہا۔

"حق آیا، باطل دور ہوا۔ ہاں باطل جانے ہی والا تھا" سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ایک بار کانفرنس کی صدارت سر آغا خاں نے کرنی تھی۔ انہیں آنے میں دیر ہو گئی۔ جلسہ شروع ہو گیا تھا کہ سر آغا خان آگئے مولوی نذیر احمد تقریر کر رہے تھے۔ نواب محسن الملک نے آغا خان کا تعارف کرایا۔ نذیر نے برجستہ کہا۔

آفاق ہا گردیدہ ام ۔ مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام ۔ لیکن تو چیزے دیگری

ایک بار مولویت کا ذکر چل پڑا۔ نواب محسن الملک عربی زیادہ نہ جانتے تھے۔ مولوی نذیر احمد کا ان کے ساتھ بڑا دوستانہ تھا کسی نے نواب محسن الملک کو مولوی کہہ کر پکارا تو مولوی نذیر احمد نے کہا۔

"اگر یہ مولوی ہے تو یہ جو سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاند خان ہے"

چاند خان مولوی نذیر احمد کا نجی ملازم تھا اور لمبی داڑھی رکھتا تھا۔

مولوی نذیر احمد کی کتابیں

مولوی نذیر احمد نے کافی کتابیں لکھیں۔ ناول لکھے خواتین کا ادب تخلیق کیا۔ قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا ان کا ناول مرآۃ العروس ۱۸۶۹ء میں چھپا "بنات النعش" جو کہ اس ناول کا دوسرا حصہ ہے ۱۸۷۲ء میں چھپا توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ فسانہ مبتلا ۱۸۸۵ء میں، ابن الوقت ۱۸۸۸ء میں، رویائے صادقہ ایامیٰ، منتخب الحکایات، موعظہ حسنہ، ترجمہ قرآن مجید، الحقوق والفرائض (۳ حصے) ۱۹۰۶ء میں لکھے گئے۔ مبادی الحکمت ۱۸۹۷ء میں اور الاجتہاد ۱۹۰۸ء میں لکھے گئے۔ ان کے علاوہ مولوی نذیر احمد نے علم ہیئت پر سموات، قواعد اردو اور رسم الخط اور نصاب خسرو وغیرہ کتابیں بھی تحریر کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے قانونی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔

مرآۃ العروس بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ چنانچہ اپنی کتاب بنات النعش کے دیباچے میں اول الذکر کتاب کی شہرت کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

"مرآۃ العروس کو پہلے پہل چھپے ہوئے اب تیسرا برس ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اسی اوپر سوا دو برس میں اس کی کوئی آٹھ نو بلکہ دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور ہر سمت سے طلب اور ہر طرف سے مانگ چلی آرہی ہے ایک بابو صاحب اپنی بنگالی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ ایک پنڈت جی مہاراج بھاکا میں، اور وہ میری استدعا و فرمائش سے بلکہ اپنی آرزو و خواہش سے۔ پسند و قبول کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی۔"

ایک دیباچے میں بنات النعش کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کتاب سے مراد تعلیم اخلاق اور خانہ داری مقصود تھی اور یہ مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ ہی ہے۔ نمونہ از بنات النعش۔

حسن آرا۔ خیر اب وہ زمین کا گول ہونا ثابت کیجئے۔ کیا آپ اس بات کو ٹالنا چاہتی ہیں۔

محمودہ۔ ہاں تو۔ یہ انگنائی پچاس گز لمبی ہے۔ اس سرے سے اس سرے تک بتیس یعنی پانچ کم وہ سی پھیرے کرو تو ایک میل ہوا اور دو میل کا ایک کوس ہوتا ہے۔

حسن آرا۔ اوہو! اتنا بڑا میل اور اتنا بڑا کوس ہوتا ہے۔

محمودہ۔ اب قطب صاحب کی لاٹ کو فرمایئے کہ کئے ہزار کوس بنی ہے

حسن آرا۔ میں تو جانتی ہوں کہ اس حساب سے پوری میل بھی لمبی نہ ہوگی۔

محمودہ۔ بے شک میل کیا میل کا دسواں حصہ بھی نہیں اور زمین بتاؤں میلوں کے حساب کتنی بڑی ہے چوبیس ہزار میل اس کا دور ہے مردوں میں بارہ کوس کی منزل مقرر ہے، یعنی مرد لوگ۔ جو سفر کرتے ہیں تو وہ بارہ کوس روز چلے جاتے ہیں، اور واقع میں آرام کے ساتھ سفر کیا جائے تو بارہ کوس دن بھر کے چلنے کو بہت ہے اس حساب سے اگر کوئی آدمی ناک کی سیدھ چلنا شروع کرے تو پانچ برس میں جہاں سے چلا تھا وہیں آکر کھڑا ہوگا اور ساس کی طرف ایک پھیرا لیا ہوگا۔

حسن آرا۔ اللہ اکبر اب جو میں خیال کرتی ہوں تو زمین بہت ہی بڑی ہے۔ بھلا تم نے کیونکر جانا کہ چالیس ہزار میل دور ہے

محمودہ۔ کتابوں سے جانا بہت والے لوگوں نے محنت اٹھا کر برسوں سفر کیا اور تمام دور ناپ ڈالا خشکی کی راہ تو سیدھا چلنا مشکل ہے۔ کہیں کہیں بڑے بڑے دو دو تین تین کوس کے اونچے، مہینوں کی چڑھائی کے دشوار گزار پہاڑ ہیں کہیں سیکڑوں کوس کے جنگل ہیں جن میں نہ کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ ہے نہ پانی کا آسرا نہ راہ نہ سڑک۔ سمندر جہازوں پر لوگوں نے سفر کیا ہے اور قطب نما کے سہارے سے سیدھا لگائے چلے گئے اور آخر کو وہیں آکر موجود ہوئے جہاں سے چلے تھے کیا اب بھی زمین کے گول ہونے میں کچھ شک و شبہ ہے۔"

اب "بنات النعش" میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب اس کے بیاہ کی تاریخ قریب پہنچی تو ہر چند گھر والوں نے اس کو مکتب جانے سے روکا مگر اس کو مکتب سے کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ ایک دم مکتب سے جدا رہنا اس کو شاق تھا جب دستور مکتب میں آتی رہی یہاں تک کہ مائیوں بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ تب اپنا رسلطانہ بیگم خود استانی اصغری خانم کے پاس گئیں سلام و دعا کے بعد سلطانہ بیگم بولیں۔ استانی جی تم میں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی آج جاؤں کل جاؤں لیکن تمہاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر میں ایک دم کی چھٹی نہیں ملتی۔ سینے میں نہیں پروتی میں نہیں مگر کام ہے کہ سمٹنے میں نہیں آتا۔ آخر آج میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی سو کام کاج کا حرج گیا اور میں نے کہا کر چلوں ذرا کھڑے کھڑے استانی جی سے مل آؤں۔

استانی جی۔ درست ہے یہ بھی تو کام کا وقت ہے۔ آپ نے ناحق تکلیف کی مجھ ہی کو بلا بھیجا ہوتا۔ میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں لگی لپٹی رہتی ہوں۔ جوڑے جو میں نے سینے اور مصالح ٹانکنے کو آپ سے منگوائے تھے، سب تیار ہیں پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا کہ جوڑے ماشاء اللہ بہت بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے امیر گھر جانے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں۔ مگر نہیں۔ حسن آرا بیگم کی محبت سے لڑکیوں نے خوب ہی جی لگا کر سیا اور مصالح بھی بہت ہی صفائی سے ٹانکا۔ اس جوڑی گلبدن کے پائجامے میں جو میں نے پرسوں سلوا کر بھیجا ہے ذرا کلیوں کا گو گھرو کھینچ زیادہ ہو گیا ہے۔ بتیرا شہر بانو کہتی رہی کہ استانی جی لاؤ ادھیڑ کر پھر ٹانک دوں۔ میں نے کہا خیر رہنے بھی دو ادھیڑنے سے گوکھرو خراب ہو جائے گا آئندہ اس کا خیال رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی مغلانیوں کو دکھایا تھا پھڑک گئیں کہنے لگیں پھر کہاں مردوں کی چکی اور کہاں عورتوں کی۔

میں۔ امی مردوں کا یہاں کیا مذکور۔

مغلانیاں۔ اے حضور! یہ جوڑا مرزا علی خان کے کارخانے کا ٹنکا ہوا معلوم ہوتا ہے اسی لیے ٹانکا ایسا درست بیٹھتا چلا گیا ہے تو لونڈیوں کے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا کام کیسا ہی کیوں نہ ہو مردوں کے کام کو نہیں پہنچ سکتا۔

میں۔ کہاں کے علی خان اور کیسے مرد۔ یہ جوڑا تو میری استانی جی کے مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور انہیں نے اس میں مصالح ٹانکا ہے۔ یہ سن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر غور دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں۔ حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں کے ہاتھ میں یہ صفائی اور تحمل ہم نے نہیں دیکھا۔

استانی جی۔ خیر اور جوڑوں کی سلائی مجھ کو بھی پسند ہے پھر آپ نے حسن آرا بیگم کے جوڑے میں دیکھ دیئے ہوتے لڑکیاں تو خوشی خوشی میں مر رہیں۔

سلطانہ بیگم۔ اور یہ سارا جہیز کس نے سیا اور کس نے ٹانکا! مغلانیوں سے تو میں نے صرف موٹا کام لیا چادریں ہو گئیں گٹھریاں ہو گئیں دسترخوان ہو گئے سوزنیاں ہو گئیں، لحاف گے، غلاف کئے

توشک، لحاف اس طرح کی چیزیں البتہ مغلانیوں نے سی ہیں یا ہاں شب خوابی کے کپڑے اکثر تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے باجی اماں کے یہاں سے پروے گئے۔

استانی جی۔ الٰہی خیر سے حسن آرا بیگم کو ایک پہ ہزار دل اور گھس پس کر پلنے ہوں۔

سلطانہ بیگم۔ (ٹھنڈا سانس بھر کر) ہاں استانی جی دعا کیجئے اللہ نصیب کرے بیٹیوں کا بھی کچھ عجیب نازک معاملہ ہے۔ کن کن مصیبتوں سے پالو پوسو پرورش کرو اور پھر دشمن پرایا کا پرایا کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی۔ ورنہ میں حسنا کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ شہر میں ایک سمدھیانہ کر کے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے کہ گئے کو توبہ کی اور کان اینٹھا۔ ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں کیسی کیسی باتیں حسنا کے واسطے منگوائیں ایک سے ایک بڑھتی چڑھتی۔ میں نے کہا حسنا ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے گی شہر میں اب بیٹی نہ دوں گی کالا منہ ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے۔ سو استانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے خدا کے ہاتھ شرم ہے۔

استانی جی۔ حسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہیے اوّل تو جھجر والے خود بڑے رئیس ہیں۔ دوسرے خاک چاٹ کر کہتی ہوں آپ انشاءاللہ دیکھ لیجئے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم تمام ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں تو مجھ کو الٹا الاہنا دیجئے گا کہ آپ کو حسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

سلطانہ بیگم۔ فرق آپ کی عنایت سے زمین آسمان کا ہے۔ آپ کے فیضان تعلیم نے خاک کو اکسیر، تانبے کو کندن، ذرے کو خورشید، پتھر کو لعل، سفید حیوان کو آدم اور حسنا کو ماشاءاللہ حسن آرا بیگم بنا دیا۔ اس کی خوبی تقدیر کی بھی ایک بڑی پریشانی ہے کہ وہ شاگرد اور آپ جیسی اس کی استانی ہے یہ ایسا احسان آپ نے ہم سب گھر والوں پر کیا کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہون منت رہیں گے۔ مگر جب سے حسنا نے بیاہ کی تیاری ہوتے دیکھی ہے کچھ سہم سی گئی ہے۔ یونہی گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا اور بھی جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ کسی سے بولتی اور بات کرتی ہے۔ ارادہ تھا کہ پورے مہینے بھر مائیوں بٹھاؤں گی اس کی حالت دیکھ کر دینے کبھار مائیوں سے بدتر تو یہ خود ہوتی جاتی ہے۔ رنگت زرد ہو گئی ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ چہرہ دیکھو اداس صورت دیکھو غمگین ہیں کہتی ہوں کہ اتنی عمر میں تو لڑکیوں کو دلہن بننے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔

استانی جی۔ حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح ناداں نہیں ہیں ماشاءاللہ بڑی فہمیدہ اور زیرک لڑکی ہے۔ یہی کچھ گھر کے چھوٹنے کا خیال ہوگا۔

سلطانہ بیگم۔ گھر کی تو اس کو مطلق پروا نہیں۔ البتہ مکتب اس کی جان ہے دیکھئے کیوں کر بچی کا دل بہلے گا۔

استانی جی۔ میں سمجھا دوں گی اور یوں آدمی اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہوتا ہی ہے“

توبۃ النصوح کا وہ حصہ ملاحظہ ہو جہاں نصوح کا بڑا بیٹا کلیم اپنے والدین سے لڑ جھگڑ کر اپنے ایک دوست کے ہاں جا کر قیام کرنے کے لئے جاتا ہے۔

”کلیم اپنی شیخی کے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا وہ بھی حقیقی نہیں، ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو عالی جاہ سرکار دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، پھر ان دنوں کی بے عنوانی، اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دہلی کے رؤساؤں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوّل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجود کہ دور کی قرابت تھی حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمے لے لیا۔ جمعدار اپنی حین حیات میں تو ایسا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے انہوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر کے مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہزار وقت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا اور سات روپیہ مہینہ کرایہ کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔

یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی یعنی تین آدمی اور سات روپیہ کی کل کائنات اس پر مرزا کی شیخی اور نمود یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کو صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہ لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعا رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زہر تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں مگر امیرزادگی نبھتی تو کیسے نبھتی۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھا اور شبنم یا ململ سی تن زیب۔ نیچے کوئی طرحدار کا سا ڈھاکے کا نینو جاڑا ہو تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم کی نہیں۔ خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا ساتانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کم خواب کی عمدہ بیل لگی ہوئی سرخ نیفہ کا پاجامہ۔ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا ریشمی ازار بند، گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھو تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گویا ایک جان دو قالب تھے کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اس غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرائے کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے۔

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا۔

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کر لے کہ جلدی سے کلیم نے کہا کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں؟

لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ مو ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے

والا نوں ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی۔ ارے کم بخت یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ کلیم کی طرف مخاطب ہو کر کہو میاں یہی نا چھریرا بدن سانولی رنگت زرد زرد سی آنکھیں کرنجی ٹھگنا قد۔ دبلا دبلا اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم۔ ہاں ہاں وہی۔

لونڈی۔ تو یہ پتا اس دکان سے چھوڑ کر اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے اسی میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے آہا! آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم۔ چلئے گا کہاں۔ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ۔ تو چلئے اس مسجد میں تشریف رکھئے بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی مسجد مزار کی طرح ویران وحشت ناک نہ کوئی حافظ نہ ملا نہ طالب علم نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ جانے کا ارادہ نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیریت شب حرام، صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمائیے میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج ان کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دو دو بڑی محل سرائیں متعدد دیوان خانے کئی پائیں باغ ہیں۔ جوڑ اور حمام اور کٹڑے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا ہوں علاقہ کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو۔ یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے ان سے ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض ہو اور متصرف ہو لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے اتنی مدت مجھ سے اور آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ جانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر گئے تھے۔ جس سے کل محلہ اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے صحبت نا ملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ بندوبست کا حوصلہ نہیں سامی رونے سے اندر باہر ویرانی چھائی ہوئی ہے اور اسی بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت اور حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو گھر سے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ خیر شام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن میں پروانے بہت جمع ہو جاویں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جائیں گے۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی بھی بہت کثرت ہے روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے تھوڑی صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا تو خود ہی پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات نہ ڈھل گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض ہی نہ ہوا اور کلیم بیچارے کو بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا۔ سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہ کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک دکان کھلی بھی ہیں تو ایسی چیزیں رہ گئی ہوں گی جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے دریا سے تھاہ کو دیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بھنوا لاؤں بس ایک دو پیسے کی کچھ کرا اور تم کو دو دو کو کافی ہوگی۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ کر باہر گئے اور چشم زدن میں چنے مسالے مگر جیسے کہہ کر گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے۔ اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے جھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا کہ کوئی ٹل ہو کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے اتنی فراست کا ہے کہ چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصہ میں چھدامی ہی کے دانے کا چینا یا نان خطائی گر جاتا ہے۔ اور واقعہ میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا

دیتا ہے۔ کیتی تیس میرے سر کی قسم کچھ کہنا ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول جیسے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ ان دانوں میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر رتی برابر بھی تم نے بھوسے کا جانہ نہ ہوگا اور سو سال کی محنت دیکھنے کو ملی بستی ہے کوئی پستی غرض دونوں رنگ خوشنما صد اقسم کے پھل اور سے زیادہ سے لگتے ہیں لیکن چنے کی قدرت کوئی نہیں پایا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنا ہے؟

کلیم فرمائیے

فرمایا جیسا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو رزاق عباد کا انتظام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یہ حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جیوں جیوں میں نے زمین سے سر باہر نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسا جیسا ظلم مجھ پر ہوا کسی پر نہیں ہوا۔ نشوونما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکرے بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ و برگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ دانہ دانہ اس کو چکی میں دلیں، گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں، گھونگھنیاں پکائیں، غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں چنے کا حضرت میکائیل کے دربار میں اسی طرح پر بے باکانہ چرچر بولنا تھا کہ حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اس کے کھانے کو دوڑا چنانچہ یہ حال دیکھ کر بے التفاتی حکم آخر رخصت ہوا سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں افسوس کہ اس وقت تک مرچ ہم نہیں پہنچ سکتا ورنہ میرمدہ کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں ...... غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلا دیا۔

کلیم بھوکا تو تھا ہی اس کو تبھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی مزیدار معلوم ہوئے مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے یا خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔

گھر کے الوان نعمت کو لات مار کر نکلا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ، نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی۔ نہ مونس نہ غم خوار۔ نہ نوکر نہ خدمت گار۔ مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغ نوگرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے بجز دم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا لیکن کلیم کا اور بہت سے مضمون سوچنے کو تھا اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار، ٹوپی، جوتی، رومال چھڑی تکیہ دری یعنی جو چیز کہ کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی لے کر چمپت ہوا یوں تو کلیم بہت دیر کو سو کر اٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی پتہ نہیں۔

مسجد ویران کی ویران تھی اس میں سایا بھی کہاں۔ صبر کر کے بیٹھ رہا۔ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آنکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک پہنچوں۔

اس میں دوپہر ہونے کو آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آ گیا جوں ہی زینہ پر چڑھا تو کلیم اس سے غرض مطلب کرنے کے لئے پکا وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ڈر کر بھاگا خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا ناچار کلیم نے بہ ہزار صعوبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو الو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو پرسوں سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔

کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کرکے ممکن ہو تو منہ ہاتھ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا کہ کیوں حضرت آپ مجھ سے بھی واقف ہیں۔ اندر سے آواز آئی ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور طاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا؟۔

تکیہ دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامل تھا کہ اندر سے آواز آئی۔ مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ دری تو اس سے لو۔

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست بیگ نے چور چور کر کے جا لیا۔

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کئے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

رویائے صادقہ

مولوی نذیر احمد کا یہ ناول ایک الگیری کی طرح ہے کردار نگاری اس میں بالکل نہیں ہے۔ واقعات سیدھے سیدھے اور عام قسم کے ہیں انداز بیان میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ جیسا کہ مراۃ العروس میں ہے۔ یہ ایک دینی اور مذہبی قسم کا ناول ہے لیکن اپنی طرز کا انوکھا ناول ہے اس میں اسلام کو عقلی بنیادوں پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح اسلام عقل کے منافی ہرگز نہیں بلکہ اس کے عین مطابق اور موافق ہے کہانی یوں ہے کہ ہیروئن اکثر ایسے خواب دیکھا کرتی ہے جو عام زندگی میں سچ ثابت ہو جاتے ہیں یعنی خواب میں جو واقعہ دیکھتی ہے وہی واقعہ زندگی میں پیش آتا ہے۔ اس کے ساتھ رہنے والے لوگ اس سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس لڑکی پر کسی آسیب کا سایہ ہے جو اسے ہونے والے واقعات کی خبر پہلے سے کر دیتا ہے۔

اس ناول کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا دھوکا ہوا ہے۔ ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو لگ بنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں۔ سو اور اصلی ایک بھی نہیں اس کو میکے ہی میں لوگ صادقہ کہنے لگے تھے۔ اس واسطے کہ اس نے ساری عمر کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا اس لئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اس کو تعبیر میں ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ اس کی رائے تیر بہدف ہوتی تھی یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو۔ بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ آدمی کا دماغ ایک لمحہ بھی بیکار نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا مگر تو بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں۔ خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جانوروں میں سے اور جانوروں کا تو حال معلوم نہیں مگر گھوڑے کو جس کا جی چاہے آزمالے کہ تھان پر کھڑا سو رہا ہے آنکھیں بند ہیں۔ خراٹوں کی آواز چلی آتی ہے اور یکایک جھنجھلا ایسے موقع پر سائیس یا جو کوئی آدمی موجود ہوتا ہے ——

نقصان ہے تھان ہے کہہ دیا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح کے خواب دیکھتا ہے۔ لوگوں نے بہت عقلیں دوڑائیں۔ مگر کسی کو ٹھیک پتا نہیں ملا کہ خواب ہے کیا چیز اور اس کی تعبیر کا اصول کیا ہے۔ ہم بھی مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے۔ جب سے صادقہ کا حال سنا۔ یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہے۔

خدا کی باتیں خدا ہی جانے

اس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح بنایا تھا۔ وہ پہلے درجہ کی ذہین تھی۔ یوں بھی لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور صادقہ تو پورے ڈھائی برس کی بھی نہ ہوگی کہ ہم نے اپنے کانوں اس کو مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر مسلسل گفتگو کرتے سنا نہ لغزش نہ لکنت نہ رکاوٹ۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس کو اپنے بچپن کے ان وقتوں کی باتیں جبکہ اس کو اچھی طرح گفتگو بھی نہیں کرنی آتی تھی۔ ایسے صاف طور پر یاد تھیں کہ گویا کل کی بات ہے ایک دفعہ کا اس نے مذکور کیا کہ میں جھولے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اوپر سے گری چھپکلی اور اتفاق سے اس وقت میرے پاس کوئی نہ تھا۔ میرے جی میں آیا کہ آواز دوں مگر بولنا نہیں آتا تھا ناچار رونے لگی۔ دوا نے مجھ کو اٹھا لیا۔ میں چپکی تو ہو گئی۔ مگر جب پھر اس نے جھولے میں لٹانا چاہا تو میں اکڑ گئی۔ دوا سمجھ گئی کہ جھولے میں لیٹنا نہیں چاہتی۔ مگر اس کو سبب کون سمجھائے۔ آخر اماں جان کا ذہن منتقل ہوا اور لگیں کہنے دوا سے ذرا بالچے کو تو دیکھو۔ جوں ہی بالچہ اٹھایا چھپکلی کو دیکھ کر وہ بھاگی۔ اماں جان نے مجھے گود میں لے کر پیار کیا اور اسی وقت چھت گیری بند کرا دی۔ تب میرے دم میں دم آیا۔ وہ ایسی باتوں کے ایسے ٹھیک پتے دیتی تھی کہ تسلیم اور تصدیق کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ غالباً اس نے خواب بھی اسی زمانے سے دیکھنے شروع کئے ہوں گے۔ مگر اس کا چرچا گھر میں اس وقت سے ہونے لگا جب سے اس کو بولنا آیا۔ جیسی اس کی عمر تھی ویسے اس کے خیالات تھے۔ ویسے ہی اس کے ان دنوں کے اس کے خواب بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دن اس کا بھائی کہ وہ بھی بچہ ہی تھا اس سے کوئی دو سوا دو برس بڑا۔ سویرے اٹھ کھانے کے لئے ضد کرنے لگا۔ ماں نے کہا باسی کھچڑی تو میں تم کو دینے کی نہیں۔ رہیں کچوریاں سو اوّل تو ابھی دکانیں نہیں کھلیں۔ اور دوسرے وہی ایسی کونسی خوبی بھری ہیں گھی کا نام اور آدھے سے زیادہ تیل اور پھر باسی کی مار۔ نہیں صاحب اماں لو ابھی میں تم کو روغنی ٹکیا ڈلوائے دیتی ہوں پھر بنا بنا کھانڈ سے کھا لینا یا مرتبے کی پھانک سے مگر خدا کے لئے اوپر سے پانی نہ پی لینا ایسا نہ ہو مچھ بات کو آپ بھی مارے کھانسی کے بے چین رہو اور ہم سب کی نیند بھی حرام کر دو یہ سن کر صادقہ بولی۔

صادقہ۔ اماں جان مربے کا مرتبان تو گر کر ٹوٹ گیا۔

ماں۔ یہ کب اور کیونکر ہوا۔

صادقہ۔ کب اور کیونکر تو سارے خواب میں دیکھا ہے۔ خواب کا سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ ماما نے جلدی جلدی آگ کر کے توا چڑھایا۔ ٹکیا پکائی۔ جو مربے کے لئے کوٹھری کھولی۔ ایک چھچھوندر ولیاں نکال کر بھاگ گئی۔ اندر جا کر دیکھا تو واقع میں مرتبان ریزہ ریزہ ہوا پڑا ہے۔ دو چار بار تو لوگ خبر نہ ہوتے لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر روز خواب دیکھتی اور جو دیکھتی وہ ہی ظہور میں آتا تو گھر والوں کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ صبح ہوئے اور سب نے پوچھنا شروع کیا کیوں بی آج کیا خواب دیکھا۔ نہ کبھی ایسا ہوا کہ صادقہ نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو۔ اور نہ ایسا ہوا کہ دیکھا ہو اور ٹھیک نہ اترا ہو۔ رفتہ رفتہ پہلے گھر میں، پھر محلے میں، پھر تو سارے شہر میں ایک غل مچ گیا۔ ادھر تو صادقہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی۔ ادھر عمر کے ساتھ ساتھ وہ خوابوں میں ترقی کر رہی تھی۔

صادقہ کے خوابوں کے سلسلے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح کسی علم کے مبتدی کو پہلے آسان آسان باتیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر بتدریج وہ مشکل مشکل کتابوں پر عبور رکھتا ہے۔ اسی طرح صادقہ کو پہلے صاف صاف خواب دکھائی دیتے تھے یعنی جو بات ہوتی۔ جیسی کی تیسی اس کو خواب میں دکھلائی دے گئی۔ وہی خواب وہی تعبیر لیکن آہستہ آہستہ اس کے خواب پیچیدہ ہوتے چلے۔ تعبیر کے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ جیسے پہیلی یا معما یا چیستاں۔ مثلاً گھر میں کسی کو تپ نہ آنی کو ہوتی تو اس نے خواب میں دیکھا بخار چڑھا ہوا ہے اور پڑے ہیں۔ پھر یوں دیکھنے لگی کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں یا آگ سے تاپ رہے ہیں اور آخر کو ایسا معلوم ہوا کہ آگے دیگچی رکھی ہے اس میں زرد رنگ کے چاول ہیں۔ مگر نیسے ہوئے۔ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ صادقہ کو خواب ہی میں اس کی تعبیر معلوم ہو جاتی تھی۔ گویا تعبیر بھی جزوِ خواب تھی۔ اور کبھی خواب میں تعبیر معلوم نہ ہوئی تو اس نے بیداری میں آپ تعبیر دے لی۔ ایک عجیب بات اور تھی کہ صادقہ کبھی فرمائشی خواب بھی دیکھتی تھی یعنی مثلاً ہم کو ایک بات معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور ہم نے اس سے درخواست کی۔ جیسا کچھ ہونے والا ہوا۔ صادقہ نے خواب میں دیکھ دیا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار کی نہ تھی۔ بہتیری مرتبہ ایسا ہوا کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا اور مچلایا بسا کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ صادقہ نے سب تو نہیں مگر اپنے نزدیک کے معرکے کے خواب تعبیر سمیت روزنامچے کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لئے تھے۔ اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے اور ہم اس کو عنقریب چھپوانے والے ہیں اس روزنامچے میں ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ غبی سے غبی اس کو پڑھ لے اور الجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سلجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا سا بھی تامل نہیں کہ صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد اتنی بات چار و ناچار تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس جہان کے علاوہ ایک عالمِ ارواح بھی ہے اور سوتے میں ہم کو اس کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر ہم اس میں مشق اور مہارت پیدا کریں تو بہت سے اسرارِ قدرت منکشف ہوں اور یہی معمولی خواب جو ہم اکثر دیکھا کرتے ہیں اور کبھی ان کی پروا نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک میں بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو ان کے دریافت کرنے کا سلیقہ نہیں۔"

ابن الوقت

مولوی نذیر احمد کے اس ناول یعنی ابن الوقت کے بارے میں سرسید کے بیٹے سید محمود نے ان سے شکایت کی تھی کہ اس ناول میں انہوں نے ان کے والد یعنی سرسید احمد کا خاکہ اڑایا ہے اور انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مولوی نذیر احمد نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو ان لوگوں کا مذاق اڑایا ہے جو انگریزی تہذیب کی تقلید میں دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔ سید احمد کا تو میرے ذہن میں خیال بھی نہیں تھا۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے ایک مضمون میں لکھا بھی تھا کہ ابن الوقت سے مراد خود نذیر احمد ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نذیر احمد صاحب پر انگریزی تہذیب کا رنگ اتنا زیادہ کبھی نہیں چڑھا تھا کہ ان کی مماثلت ابن الوقت کے ہیرو سے ہوتی۔ ابن الوقت ہیرو کا نام ہے۔ جو ایک انگریز مسٹر نوبل کے اثر میں آکر اپنی مشرقی وضع کو چھوڑ کر انگریزی تہذیب کی کورانہ تقلید میں اپنا سب کچھ بھلا بیٹھتا ہے۔ اس ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ابن الوقت نے اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہے مگر میرا حال یہ ہے کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک نا سیری نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ابن الوقت کے خاص خدمت گار کی زبانی معتبر روایت ہے کہ ایک بار اس کو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بکنے۔ تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا اور کھانے بھی پلاؤ، زردہ، متنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا، دھلی ماش کی پھریری دال، امرود، دال کے کچالو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھٹی چیزوں کو ترس گیا تھا۔ معلوم ہے کہ ابن الوقت ابتدائے تبدیلِ وضع سے گھر بار چھوڑ کر باہر چھاؤنی میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اس کی کوٹھی کا احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ تھا۔ لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اداس تھی جیسی ایک بجلیک کی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیر چشم تھا۔ اس کے یہاں نوکروں

لی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کروتی کی اتنی بڑی چھاؤنی میں بس دو چار ہی جگہ اور ہوں گی اس لیے تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے اور حقیقت امر یہ ہے کہ ان ہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں بات بھی بنا رکھی تھی مگر نوکر کیسے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں پھر بھی مالک کی تائید کی ضرورت باقی رہتی ہے انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا، صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبر گیری کے لیے یہ شکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی مذاق کے خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود ہمسر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے ایسی خواہش تراش ایجاد کرنے لگا تھا کہ خواہی نہ خواہی اس کو دیکھنا پڑتا تھا۔ دعوت ایسے مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا دونوں ہی خوش ہوتے ہیں۔ مگر ابن الوقت کے یہاں کی دعوت اس کے حق میں ایک مصیبت ہوتی تھی۔ کھانا تو کہیں جا کے رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی آندھی بجے صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو کوئی ایسی دعوت یاد نہیں کہ ابن الوقت کہ ان کی وجہ سے اس کے بعد علیل نہ ہوا ہو۔ پھر چھٹے چھ ماہے دعوت ہو تو خیر یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اٹھتا تھا کہ میں نے کہاں کا کھڑاگ اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ابن الوقت بیچارے مصیبت کے مارے کو ایک سے ایک سخت مشکل درپیش تھی کہ وہ تو وہی ہٹ کا پورا تھا کہ ان آفتوں کو بری طرح یا بھلی جھیلتا رہا۔ دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوا ہوتا اور پھر اس کا نام نہ لیتا "ہاتھیوں کے ساتھ گنے کھانا کچھ لڑکوں کا کھیل ہے"

ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصہ خوش حال تھا۔ قلعے کی تنخواہیں تو تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام و اکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رہتا تھا۔ ہمارے اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپیہ ماہوار سے ہرگز کم نہیں تھی اور غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ نہ سو نہ سوا سو۔ ماشاء اللہ ایک دم سے پانچ سو۔ اس آمدنی پر اچھے سے اچھا کھانا، اچھے سے اچھا پہننا، غرض امیرانہ خرچ رکھتا۔ مگر ہندوستانیوں کا سا ہوتا تو چند سال کے عرصہ میں اس کے پاس معتد بہ سرمایہ ہو جاتا۔ لیکن اس نے کرنی چاہی انگریزوں کی بریس۔ پورا برس خیریت سے گزرنے نہیں پایا کہ لگا ادھار کھانے جس وقت اس کو جان نثار نے نہلا دھلا کر پہلے پہل انگریزی کپڑے پہنائے تو کوٹھی کا ساز و سامان اور اپنی شان دیکھ کر اس کو اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتا تھا۔ اور ابھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر باقی تھا کہ ایک چپراسی بڑا لمبا چوڑا لفافہ لیے ہوئے برآمدے تک آیا۔ قاعدے کے مطابق بیرا بیرر نے لفافہ کشتی میں رکھ کر نئے صاحب کے حضور میں پیش کیا۔ کھولا تو جنرل سپلائر کا بل تھا۔ کتنے کا؟ کچھ اوپر پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ حواس مختل ہو جائیں مگر "سنگ آمد و سخت آمد" چون و چرا کرنے کا موقع نہیں۔ "قہر درویش بر جان درویش" دینا ہی پڑا۔ مگر کیوں کر؟ ہزار کا توڑا نوآن صاحب کا دیا ہوا سربند رکھا ہوا تھا وہ لیا اور ہزار بشکل دو ہزار گھر میں سے فراہم کیے۔ پھر بھی سوا دو ہزار اور رہے تو پنڈ چھوٹے۔ بارے غدر سے پہلے نواب معشوق محل بیگم صاحب کی سرکار میں ابن الوقت کی معرفت گڑ والوں کا لین دین تھا۔ ڈرتے ڈرتے ان کو رقعہ لکھا۔ اسامی تھی کھری اور رجان دار، انہوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا یوں جنرل سپلائر کا پوت پورا ہوا لیکن ابن الوقت نے خرچ کا ڈربا کھول دیا تھا جس نسبت سے ان کی آمد بڑھی تھی۔ اگر اسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو چنداں حرج کی بات نہ تھی۔ پر اس نے لیٹنے کے ساتھ چادر کے باہر پاؤں پھیلا دیے۔ اول سرے گھر کے تہرے چوتہرے مکان ہوتے ساتے چالیس روپیہ کا بنگلہ پھر فٹن، ٹم ٹم، بروم، بانکی گاڑی، چار قسم کی بگھیاں، دو ر چار کے چار گھوڑے اور ایک نزین سواری کا، پانچ، دھوبی، سقہ، چوکیدار، فراش، باورچی، سائیس، گھاس کٹ، مہتر، مالی، بہرا، دو ڈھائی درجن کے قریب شاگرد پیشہ۔ ان کی تنخواہوں کے علاوہ، وردی، اس کی مناسبت سے دوسرے مصارف۔ بلمقتضا میز کرسی کہ اس کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ مہینے میں اچھے جید دو کھانے بھی ہو گئے تو ساری تنخواہ پر پانی کا پھر جانا کچھ بات نہیں۔

ابن الوقت نے شروع میں شاید تین یا چار تنخواہیں وقت پر لی ہوں گی سو اس کے بعد سے تو خزانچی کے ساتھ معاملہ ہو گیا۔ ایک چھوڑ دو مہاجن دینے والے جب ضرورت ہوئی جتنا چاہا منگوا لیا۔ تنخواہ تو اوپر سے اوپر خزانچی لے لیا کرتا تھا اور زمینداری کا محاصل گڑ والوں کی کوٹھی میں چلا جاتا تھا۔ ان بجا گو صاحب بننے کی دھن میں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ سر پہ کتنا قرضہ لدتا چلا جا رہا ہے۔ غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی بات کی رٹ نہیں لگ جاتی بس ابن الوقت کو صاحب بننے کی رٹ تھی۔ شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی ساری ریفارم اسی پر منحصر ہو گئی تھی کہ یورپ کے اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی طرز چھوٹنے نہ پائے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تیرے پاس اتنا پیسہ بھی ہے۔ جتنا ان کے پاس ہے؟ کم بخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی کچھ ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنہوں نے ذرا سی انگریزی پڑھی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے تباہی کے لچھن سیکھتے چلے جاتے تھے۔ اس کے اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی ظاہر میں دیکھتے تھے کہ انگریزوں سے ملتا جاتا ہے۔ جو بات کسی ہندوستانی عہدیدار کو نصیب نہیں، اس کو حاصل ہے اور لوگوں کی نظر میں انگریزی وضع خدا کے فضل سے جو کسی ایک کو پھلی ہو سبھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان اٹھایا اور شاید نقصان بھی نہ اٹھایا تو کسی قسم کا فائدہ تو ہوا نہیں، اور ہوتا کیسے؟ کوئی مفلس آدمی مالداروں کے سے کام کرنے لگے تو وہ کیوں کر پنپ سکتا ہے؟"

فسانہ مبتلا

یہ کتاب یعنی ناول مسلم شرفا کی خاندانی معاشرت کی ایک ہو بہو تصویر ہے اور یہ عہد غدر کے بعد کا نوشتہ ہے۔ پروفیسر افتخار احمد صدیقی صدر شعبہ اردو اسلامیہ کالج لکھتے ہیں۔

"ناول کا سن تصنیف ۱۸۸۵ء ہے لیکن مختلف اندرونی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قصے کا تعلق انیسویں صدی کے نصف اول سے ہے اس زمانے کو مدنظر رکھئے تو ناول میں بہت سی باتیں غلط معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً خفیہ پولیس کے آدمیوں کا میر متقی سے یہ پوچھنا کہ "مہدی" جنہوں نے مصر میں خروج کیا ہے۔ مہدی موعود ہیں یا نہیں "تاریخی اعتبار سے غلط ہے ناول کی تصنیف کا زمانہ یقیناً مہدی سوڈانی کے عروج و خروج کا زمانہ تھا لیکن ناول میں میر متقی اور مبتلا کے یہ واقعات اس سے چالیس پچاس سال پہلے کے ہیں۔ ناول کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے مختلف مظاہر سے ہے لیکن ناول نگار زندگی کا محض عکاس نہیں ہوتا وہ مبصر اور فن کار بھی ہوتا ہے۔"

اب ملاحظہ ہو نذیر احمد کے ناول فسانہ مبتلا میں سے ایک خصوصی اقتباس۔

مبتلا کا دام محبت میں مبتلا ہونا

عارف تو یہ کہہ کر اسی وقت رخصت ہو گیا۔ بہت کے شیاطین برابر اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ میر متقی کا جانا سنتے ہی سب نے چاروں طرف سے یورش شروع کی۔ مبتلا تو ایک مدت سے ادھار پر عیاشی کر ہی رہا تھا۔ سیکڑوں روپے ان لوگوں کے اس پر چڑھے ہوئے تھے پہیے کے لیے ہوئے خدا جانے میر متقی کے رہتے ہوئے بھی انہوں نے کیوں کر صبر کیا ہو گا۔ میر متقی کا اگر جانا نہ ہوتا تو آخر ایک نہ ایک دن اس قرض کا جھگڑا ان کے روبرو پیش ہوتا پر ہوتا اور ان کے روبرو پیش ہوتا تو وہ عمدہ طور پر فیصلہ بھی کر دیتے۔ اب اونے پونے کیسے سوئے ڈیوڑھے کی قسط بندی پر قرضے کا چکوتا ہوا اور ان لوگوں کے پاس آ کر بیٹھنے بات کرنے

سے مبتلا کی طبیعت جو میر متقی اور عارف کے سمجھانے سے کسی قدر سنبھل چلی تھی، پھر بگڑی، سامان تو ایسا بندھا تھا کہ مبتلا پھر بدستور سابق آوارہ مزاج ہو جائے، مگر ادھر تو نصیحت کے خیالات تھے تازہ اور اودھر ادائے قرض کی وجہ سے مبتلا کو ان لوگوں سے ہوئی ایک طرح ناخوشی اور تو کسی کے پاؤں نہ جمے، مگر اب سے کوئی تین چار برس پہلے کا مذکور ہے مبتلا کے والدان دونوں زندہ تھے اسی محلے میں مبتلا کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک عورت کرائے کے مکان میں آ کر رہی، وہ تھی تو لکھنؤ کی کمائی خانگی، پر اس نے اپنے تئیں بیگم مشہور کیا، باوجودیکہ تھوڑے ہی دنوں کی آئی ہوئی تھی مگر سارے محلے میں اس کی خوبصورتی اور لیاقت کا غل مچ گیا عیاش مزاجوں میں جو جس ڈھب کا تھا اپنے شوق کی چیز میں بیگم کا مداح تھا، شاعر کہتے تھے فی البدیہہ شعر کہتی ہے ستار بجانے والوں میں چرچا تھا کہ بول خوب بجاتی ہے۔ تاش گنجفہ، چوسر، شطرنج کھیلنے والے ان تمام کھیلوں میں اس کے کمال کے قائل تھے۔ ضلع جگت، پھبتی، حاضر جوابی، پہیلی کہہ مکرنی نسبت میں سب مانتے تھے کہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کی خوبصورتی میں لوگ کچھ کلام کرتے تھے، مگر اس کے جامہ زیب ہونے پر سب کو اتفاق تھا۔ مبتلا تو خود ایسی خبروں کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا، اس کو بیگم کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا ہوگا، لیکن باپ کے رہتے محلے کے محلے میں بدلحاظی نہیں کر سکتا تھا، نہ جا سکا۔ باپ کے مرے پیچھے جب مبتلا کھل کھیلا، تو جہاں اس نے اور نالائقیاں کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بیگم سے ملا۔ شاعری اور ستار اور شطرنج اور کیا اور کیا، یہ تو سب مبالغے تھے، مگر اس میں شک نہیں کہ عورت تھی بڑی گویا۔ اس کی زبان کہے دیتی تھی کہ خواہی یا مصاحبت یا کسی دوسرے طور پر اس نے بادشاہی محلات میں ضرور تربیت پائی ہے، یا کیا عجب ہے کہ جیسا وہ کہتی تھی خود بیگم رہی ہو۔ لسانی کے علاوہ اس کا سلیقہ مجلس بھی بہت ہی دلکش تھا۔ وہ نہایت جلد آدمی کے دل کو ٹٹول لیتی اور ہر ایک کے ساتھ اس ہی کے مذاق کی باتیں کرتی، یہ عمل تھا جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی تھی، ورنہ صورت شکل کے اعتبار سے وہ کچھ چنداں قدر کی چیز نہ تھی۔ مبتلا کے ساتھ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ پہچان گئی کہ یہ کوئی بنا مردوا بلہ ہے۔ اس نے مبتلا کو دور سے کھڑے ہو کر ایسے انداز کے ساتھ سلام کیا جیسے کوئی ہندو آفتاب کو ڈنڈوت کرتا ہے اور گاؤ تکیہ جس سے وہ لگی ہوئی بیٹھی تھی، چھوڑ اپنی جگہ مبتلا کو بٹھایا اور آپ مؤدب سامنے ہو بیٹھی۔ مبتلا نے چاہا کہ اس کو اپنے برابر بٹھائے مگر وہ "ایاز قدر خود بشناس"[1] کہہ کر پہلو پر نہ آئی۔ مبتلا تو تمہید کلام ہی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں وہ آپ ہی بولی "ایک مدت سے دلی کی تعریفیں سن سن کر جی پھڑکتا تھا اور دل میں ارمان تھا کہ اگر پر ہوتے تو اڑ کر جاتی اور ایک نظر دلی کو دیکھ آتی۔ ہمارے سان نہ گمان خود بخود ایسا اتفاق پیش آیا کہ خدا نے دل میں لا بٹھایا، اور جیسا سنا تھا اس سے ہزار حصے بڑھ کر پایا، چشم بد دور لکھنؤ میں دولت کی افراط ہے اور لوگ بھی وہاں کے بڑے زندہ دل ہیں۔ حسن کی جو قدر و منزلت ہمارے لکھنؤ میں ہے کسی دوسرے شہر میں کم ہوگی اور یہی سبب ہے کہ ملکوں ملکوں سے حسن کھنچ کر سب لکھنؤ میں سمٹ آیا ہے اور میرا رہنا بھی ایسی ہی جگہ ہوا ہے کہ اس کو حسن کا اکھاڑا کہنا چاہیے، مگر اپنا شہر ہے تو ہونے وہ بات تو یہی ہی کہی جائے گی۔ ماشاء اللہ آپ کی صورت کا آدمی بھی میری نظر سے تو نہیں گذرا۔"

مبتلا: "یہ تو سب تمہاری مہربانی ہے۔ چونکہ تم نظر محبت سے دیکھتی ہو تم کو میری صورت بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ہم مردوں کی صورت اگر اچھی ہوئی تو کیا، بے مصرف۔ صورتیں تو تم لوگوں کی ہیں کہ ایک عالم تمہاری ان صورتوں ہی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے میں نے بھی تمہاری صفت و ثنا بہت کچھ سنی تھی اور تمہارے دیکھنے کے لئے دل بے قرار تھا، مگر موقع نہیں بن پڑتا تھا۔ اب جو تم کو دیکھا تو معلوم ہوا حقیقت میں لکھنؤ کی تراش خراش اور وضعداری کو دلی والے نہیں پا سکتے۔ یہ تو کہو کہ گھر تمہارا ٹھہرا لکھنؤ، یہاں دلی میں کب سے قیام کیا ہوا؟"

بیگم: "ہم لوگوں کا کم بخت اس طرح کا برا پیشہ ہے کہ قرآن کا جامہ پہن لیں تب بھی تو کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، میں ایک عزت دار خاندان کی بیٹی ہوں، خدا جانے یہ بھی کرم میں کیا لکھا تھا کہ ایسے برے احوال سے پردیس میں پڑی ہوں۔ میرا حال اس قطعے کا مصداق ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میں جس وقت لکھنؤ سے نکلی، دل میں یہ ٹھان کر نکلی کہ اب اس شہر کو منہ دکھائی ہے جیتے منہ نہیں دکھاؤں گی۔ جس حالت میں آپ مجھ کو دیکھتے ہیں، جس قدر مجھے اس سے نفرت ہے بس خدا ہی کو خوب معلوم ہے، مگر موت اپنے بس کی نہیں، شاد[2] یا بد زیستن ناشاد باید زیستن۔ آج اگر کوئی بھلا آدمی خدا اس کے دل میں رحم ڈالے اور میری دستگیری کرے، تو مجھ کو چرخہ کاتنا منظور، چکی پیسنی قبول، میں اس کی کفش برداری کو حاضر ہوں، مگر جان نہ مان، میں تیرا مہمان، زبردستی کس کے سر ہو جاؤں، آپ سے آپ کس کے ساتھ لگ لوں؟" ہر چند مبتلا کی آوارگی ان دنوں بڑے زوروں پر تھی، مگر اس کے دل میں کسی عورت کے ساتھ تعلق لازمی پیدا کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ بیگم کی سحر بیانی تھی کہ ابھی اس کی تقریر پوری نہیں ہونے پائی کہ مبتلا نے اس کو گھر میں ڈال لینے کا پہلے پہل کچھ یوں ہی سا ارادہ کر لیا۔ بیگم میں دو باتوں کی کمی تھی۔ ایک تو اس کی صورت کچھ بہت عمدہ نہ تھی۔ بنانے سنوارنے سے وہ اچھی بھی نظروں میں جچتی تھی۔ دوسرے گانا ناچنا جس کی ان دنوں مبتلا کو چاٹ لگی ہوئی تھی، اس کو مطلق نہیں آتا تھا، تاہم اس نے اپنی لسانی سے مبتلا کو پہلی ہی ملاقات میں اتنا گرویدہ کر لیا کہ شام کا گیا گیا ڈیڑھ پہر رات کی توپ اس کو وہیں بیٹھے بیٹھے چل گئی۔ اسی اثنا میں بیگم نے خوب مزے مزے کی گلوریاں اپنے ہاتھ سے بنا بنا کر مبتلا کو کھلائیں۔ دو دور چائے اور کافی کے چلے۔ مبتلا اگر ایک جلسے میں مدعو نہ ہوتا تو اس سے رات کا رہ پڑنا بھی کچھ تعجب نہ تھا۔ بارے مکان پر سے آدمی آیا کہ صاحب جلسہ خود آپ کو لینے آئے ہیں، ناچار اٹھنا پڑا اور جلسے کی سن کر بیگم کو بھی اصرار کرنے کا موقع نہ تھا، مگر چلتے چلتے بیگم نے اتنا عہد تو لے ہی لیا کہ جلسے کے سوائے اپنے یہاں ہو یا کسی دوست کے یہاں، بلا ناغہ ہر روز ملاقات ہوا کرے گی اور میر متقی کے آنے تک ایسا ہی ہوتا رہا اور اتنے دن میں بیگم نے مبتلا کے دل میں بخوبی اپنی جگہ کر لی۔ میر متقی کی لاحول سے جہاں اور شیطان بھاگ کھڑے ہوئے تھے ان میں ایک بیگم صاحب بھی تھیں۔ میر متقی کے رہتے بھی بیگم نے بہتیرے ڈھب لگائے کہ مبتلا، زیادہ نہیں تو کبھی کبھار، کھڑے کھڑے صورت دکھا جایا کرے، مگر مبتلا خود ان دنوں پہلے سے اکھڑا ہوا تھا۔ آنا جانا تو درکنار زبانی سلام و پیام تک کا بھی وہ روادار نہ ہوا۔ مبتلا بے چارے کے حال پر خیال کر کے کس قدر افسوس آتا ہے

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

قریب تھا کہ بیگم تو اس کو صبر کر کے بیٹھ رہے، اتنے میں تو میر متقی کو سنا کہ تشریف لے گئے بیگم تو اس خبر کو سنتے ہی مارے خوشی کے اچھل پڑی اور اسی وقت سے لگی مبتلا کے انتظار میں بار بار مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے۔ ایک دن گزرا، دو دن گزرے، تین دن گزرے، مبتلا

---

[1] ایاز اپنی حیثیت کو پہچان! اس تقرب کے باوجود تو ایک ادنیٰ غلام ہے۔ اظہار انکسار کے موقع پر کہا جاتا ہے۔

[2] خوشی ہو یا کہ غم ہر حال میں جینا ہی پڑتا ہے۔

کا پتا نہیں، کبھی کہ چھلاوے ضرور بھیجتے کہ کچھ پٹی پڑھائی۔ آخر جب اپنے اہلِ برادری کو سنا کر حساب کتاب کو آنے لگے تو اس نے بھی کسی کے ہاتھ ایک رقعہ بھیجا (رقعہ)[3] "جانِ من! ایا بابا ہو سودا شودی ویا بابا بے بسی گی!! اس قدر بے مروتی! الٰہی بے وفائی! کچھ قصور؟ کوئی خطا؟ ملنے کے ایسے بودے اور ارادے کے اتنے کچے تھے تو استاد ربط بڑھاتا، ایسا گھبرا اختلاط کرنا کیا ضرور تھا! از برائے خدا چند لمحے کے لیے تشریف لاؤ اور اپنی حقیقت مجھ کو سناؤ۔ میں خدانخواستہ کوئی بلا نہیں کہ چمٹ جاؤں گی۔ آپ کوئی بچے نہیں جو کہ پھسلاؤں گی اور آپ کو آنا منظور نہیں تو مجھ سے وہاں پہنچنا کچھ دور نہیں۔ بشعر:

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مبتلا یہ رقعہ پڑھ کر غور طلب میں تھا کہ عارف اس کے سر پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ عارف کے چلے جانے کے بعد مبتلا نے رقعے کو پھر کئی بار پڑھا۔ وہ اس وقت جانے میں ہچکچاتا تھا، مگر پھر اس نے سوچا کہ اگر میں نہ گیا تو بیگم خود چلی آئے گی، اس سے تو میرا جانا بہتر ہے۔ غرض دل خوب مضبوط کر کے بیگم کے گھر گیا، مگر افسوس ہے کہ کچھ ایسی گھڑی گیا کہ بس اسی کے گھر کا ہو رہا۔ بیگم نے جو کئی مہینے کے بعد مبتلا کو دیکھا تو نہایت تپاک سے ملی۔ بس اس کا وہ تپاک ایک جادو تھا کہ مبتلا کی تو کیا حقیقت تھی، اس کے چچا باوا میر متقی صاحب بھی ہوتے تو پھسلتے نہیں تو لڑکھڑا تو ضرور جاتے۔ دیر تک آپس میں گلے شکوے ہوتے رہے۔ آخر مبتلا نے شروع سے آخر تک، میر متقی کا آنا اور سامور خانہ داری کی اصلاح اور ان کی نصیحت اور ناظر کی نصیحت اور میر صاحب کا تشریف لے جانا اور عارف کا سمجھانا اور سامان نشاط کا حساب کتاب، فرداً فرداً بیان کیا۔ بیگم نے بہت ہی توجہ سے مبتلا کے قصے کو سنا اور کہا کہ اتنے دن برابر جو آپ کا آنا نہ ہوا اس سے مجھے بڑی آزردگی ہوئی تھی اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آپ سے اخیر دو دو باتیں کر کے ضرور اس محلے سے اٹھ جاؤں گی، مگر اب جو آپ سے ساری حقیقت معلوم ہوئی، میرا جی بہت خوش ہوا اور اگر میں جاتی ہوتی تو ضرور میر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرتی۔ سبحان اللہ! اچھوں کی اچھی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے باپ سے بڑھ کر آپ کے ساتھ سلوک کیا۔ ان کے فرمانے پر چلو تو دنیا اور دین دونوں میں سرخ رو۔ میں تو خود آپ سے کہنے والی تھی کہ ان بیسواؤں سے ملنا اور یوں پیسے کو برباد کرنا اور یہ ہرجائی پن اچھا نہیں۔" مبتلا: "مشکل یہ آ پڑی ہے کہ بی بی کی طرف تو مجھ کو رغبت نہیں، پھر اب کسی طرح زندگی بسر بھی کروں یا نہ کروں۔" بیگم: "کیا ہے تا بی بی سے اگر مرضی نہیں ملتی تو ایک اپنی مرضی کی بی بی کر لو۔ خدا نخواستہ تم کچھ غریب نہیں ہو کہ دو بیبیوں کا خرچ نہ چلا سکو گے۔ مردوں پر تو خدا نے تنگی نہیں کی، ایک ایک کو چار چار کا حکم ہے۔" مبتلا: "تم مجھ سے نکاح پڑھانے پر راضی ہو؟" بیگم: "میں تو خود تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں اس حالت میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ میں تو کوئی دن جاتا ہے کہ کسی نہ کسی کا دامن پکڑ کر بیٹھ رہوں گی، اور اگر تم میری دست گیری کرو تو زہے قسمت، مگر تم کو بہتیری مجھ سے بہتر ملیں گی۔ نکاح کرو تو ایسی کے ساتھ کرو کہ پھر بی بی کی تمنا باقی نہ رہے، بلکہ مناسب تر یہ ہے کہ نکاح مت پڑھاؤ، چندے کسی کو آزماؤ۔" مبتلا: "میں تو فکر کرتے کرتے تھک گیا اور سوچتے سوچتے میرا سر دکھنے لگا۔ چچا باوا اور میاں عارف کی تو مرضی یہ ہے کہ میں ساری عمر رنج و غم میں گھل گھل کر مر جاؤں۔" بیگم: "توج، دور پار، الغیب وشمناں! رنج کرے تمہاری بلا اور غم اٹھائے تمہاری پاپوش۔ دنیا میں بار بار جنم لینا نہیں اور جوانی کی عمر بھی چلتی چھاؤں ہے۔ جب اپنا ہی جی خوش نہ رہا تو دنیا کو لے کر کیا چولہے میں ڈالنا ہے!" مبتلا: "دل پر تو قابو نہیں چلتا۔ اس بی بی سے ممکن نہیں کہ مجھ کو انس ہو۔ چار و ناچار دوسری بی بی تو کرنی پڑے ہی گی۔ اچھا تو آج کے آٹھویں دن؟" بیگم: "بلکہ پندرھویں دن، مگر ایک شرط سے کہ بہت درست جو کچھ کہنا ہو تم خود آ کر مجھ سے کہنا، ایسا نہ ہو کہ پہلے کی طرح بیٹھ رہو۔" مبتلا: "نہیں، کچھ ہی کیوں نہ ہو میں ضرور خود آؤں گا، بلکہ ہو سکا تو بیچ میں بھی ایک دو پھیرے کروں گا۔" بیگم: "قسم کھاؤ۔" مبتلا: "تمہاری جان کی قسم۔" بیگم: "میری جان تو تم ہو!" مبتلا: "اپنے سر کی قسم۔" یہ عہد و پیمان ہو کر مبتلا بیگم سے رخصت ہوا، مگر سچ پوچھو تو آج ہی کا جلسہ جلسۂ نکاح تھا۔ بیگم ایک بلا کی عورت، اور اس کو بشرے سے دلی حالات کے معلوم کر لینے کا بڑا ملکہ تھا۔ آج کی ملاقات میں اس کو پورا یقین ہو گیا کہ مبتلا پر اس کا جادو چل چکا ہے اور اسی بھروسے پر اس نے آپ مہلت دی، ورنہ وہ ایسا ڈھنگ ڈالتی کہ نکاح پڑھائے بے مبتلا جانے کا نام نہ لیتا۔ بیگم کے پاس یہ آج کا جانا مبتلا کے حق میں غضب ہو گیا۔ اس کو میر متقی نے ایک حالت پر بلایا اور انہوں نے اور عارف نے اس کو اس کو ٹھیل ٹھیل کر کچھ دور سرکایا، آج وہ پھر اپنی جگہ پر عود کر آیا۔

مبتلا کی خانہ داری دونوں بیبیوں کے ساتھ کس طرح پر تھی

مبتلا اور ہریالی کی یہ لڑائی تو خیر اتفاقی بات تھی، مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں باہمی ارتباط کس درجے کا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلطی کی۔ ہریالی نے سمجھا تھا کہ یہ آدمی ہے حسن پرست، بیوی اس کو بھاتی نہیں اور وہ مجھ پر ہو رہا ہے لٹو، میں گئی نہیں اور اس کی بیوی سے تڑا پھڑا اپنے کھونٹے سے باندھا نہیں۔ یہاں آ کر دیکھا تو بیوی کو میاں کا خصم پایا کہ وہ اس کو اس طرح میٹھی ہے جیسے مکھی کو شہد۔ یہ بہتیری کوشش کرتا ہے کہ اس سے چھوٹ جاؤں، مگر اور پھنستا چلا جاتا ہے۔ چاہیے تھا کہ مجبور سمجھ کر معذور رکھے، خود غرضی جبر و اختیار میں فرق کرنے نہیں دیتی تھی۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اور یہ جانتی تھی کہ اپنے ہیٹے پن سے خود نہیں کرتا۔ وہ وادی اور قربان تھی جب تک توقع بس جان تھی، ناامیدی کا پیدا ہونا تھا کہ صاف ہتے سے اکھڑ گئی۔ مبتلا تو اول دن سے حسن صورت کے پیچھے ایسا فریفتہ تھا کہ خوبصورتی کے آگے حسب نسب، سلیقہ، ہنر، عقل، نیکی، دین داری کسی چیز کو دیکھتا ہی نہ تھا۔ بیوی سے تھی اس کو نفرت، بیوتوں کی طرح دو چار بار رات کو ہریالی کے یہاں گیا، آنکھوں میں کھب گئی، نہ انجام سوچا، نہ عاقبت کار پر نظر کی، گھر میں لا بٹھایا۔ مبتلا کے دل کو جو اچھی طرح سے ٹٹول کر دیکھا تو گھر میں آئے پیچھے ہریالی کی طرف اس کا گلا سا رخ نہ تھا۔ اول تو اس نے ہریالی کے جانچنے اور آنکنے ہی میں غلطی کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہریالی خوبصورت تھی، مگر نہ اس درجے کی کہ مبتلا جیسا حسین آدمی اس پر مفتون ہو۔ یونیورسٹی کی ڈگریاں اگر خوبصورتوں کو ملتی ہوتیں تو ہریالی ہماری نظر میں اس سرے بس ایف اے کے قابل تھی، مگر مبتلا تو اس کو نکاح سے پہلے ایم اے کے درجے میں سمجھتا تھا۔ دوسری ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ ہریالی کو ویسا بناؤ سنگار نہ تو اب میسر تھا اور نہ اس کا موقع تھا اور سب سے بڑا سبب تو ہمارے سمجھنے میں یہ تھا کہ کیسی ہی کوئی نعمت کیوں نہ ہو اس کی قدر طلب تک رہتی ہے، حاصل ہوئی اور اس کی منزلت گھٹی، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ انسان کو اس کا احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ یہ نعمت کچھ نعمت بھی ہے یا نہیں۔ اگر غیرت بیگم کو ذرا بھی عقل ہو کر خدمت اور اطاعت سے میاں کو اپنا کرنا چاہیے تو ہریالی کی اتنی بھی قدر نہ ہو۔ یا اپنی صورت کو آئینہ لیے بیٹھی چاٹا ہی کرے اور اندر باہر غیرت بیگم ہی غیرت بیگم رہے۔ مگر وہ چال اپری چلی، اس نے چاہا کٹکوڑوں سے، دباؤ سے، بھائیوں کی حمایت سے مبتلا کو زیر کرنا، دل پھٹتے گئے اور طبیعتیں ہٹتی گئیں۔ ہریالی نے پایا میدان خالی، مبتلا کے دل میں جگہ کر لی، نہ خوبصورتی کے برتے پر، بلکہ سلیقے اور رضاجوئی کے بل پر۔ غیرت بیگم کے جھگڑے مبتلا کو چین تو لینے دیتے ہی نہ تھے، وہ ہریالی کی خوشی کیا مناتا۔ دونوں میں میل جول رہا، مگر عاشقی معشوقی کا سا نہیں، بلکہ جیسا کہ عام طور پر میاں بیبیوں

---

[3] پہلے ایڈیشن میں القاب (جانِ من!) اور خاتمے کا شعر درج نہیں، دوسرے ایڈیشن میں اس تحریر کو باقاعدہ ایک رقعے کی صورت دی گئی ہے۔

[4] پہلے اتنی گرم جوشی اور اب ایسی بے رخی۔

میں ہوا کرتا ہے۔

مبتلا نے تنگ ہو کر دونوں گھروں میں رہنا چھوڑا اور اس کی حالت یومًا فیومًا ردی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ایک دن مر کر رہ گیا۔

جس شخص کی پینسٹھ کی آمدنی جا کر ستائیس کی رہ جائے اور وہ بھی فرسودہ، اس کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ تواتر مصائب اور ہجوم افکار نے مبتلا کو اس قدر تنگ مزاج کر دیا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز اس کو بھلی نہیں لگتی تھی۔ اس کو ہریالی کی لڑائی کا ایک بہانہ مل گیا اور اس نے دونوں گھروں کا جانا قاطبۃً موقوف کر دیا۔ سارے دن رات اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے اکیلا مردانے میں پڑا رہتا تھا۔ نہ خود کسی کے پاس جاتا اور نہ اپنے پاس کسی کے آنے کا روادار ہوتا۔ اگر اتفاق سے کوئی آنکلتا تو اس کی طرف مطلق ملتفت نہ ہوتا۔ اس رنج نے اس کو رہا سہا اور بھی مجبور کر دیا کہ وہ دشمن اس کے اور تیار ہوئے، ناظر سے بڑھ کر معصوم اور عزت بیگم سے زیادہ بتول۔ مبتلا اپنی طرف سے بہتیرا دونوں کو لپٹاتا تھا، مگر یہ دونوں اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمارا باپ ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا باپ کو سنا برا سنا۔ پس دونوں کے ذہن میں اس کی برائی ایسی راسخ ہو گئی تھی کہ بابا یا ابا یا باپ کہنا کیسا، دونوں خاصی طرح نام لیتے تھے، معصوم گالی کے ساتھ اور بتول کو سنے کے ساتھ۔ مبتلا نے جب دونوں گھروں سے طول ہو کر مردانے میں رہنا اختیار کیا تو اس نے یہ خاصی تدبیر سوچی تھی اگر ہو سکے تو معصوم اور بتول دونوں کو ورنہ اکیلے معصوم کو خالی بیٹھا ہوا پڑھاؤں اور اسی طرح اپنا جی بہلاؤں، مگر معصوم پیٹھے پہ ہاتھ تو دھرنے ہی نہیں دیتا تھا[1]۔ مردانے مکان میں بے رونقی تو ہریالی کے ساتھ آ چکی تھی، اب تھوڑے ہی دن میں خاک اڑنے لگی۔ جس مکان میں عمدہ اسباب کے انبار لگے پڑے تھے اب اس میں کیا رہ گیا، بانوں کے چند جھلنگے۔ ایک کی چول ٹوٹی ہوئی ہے تو دوسرے میں ادوان نہیں۔ کسی کی پٹی جھکی ہوئی ہے تو کسی کے سیرو ے[2] میں جان نہیں۔ شاید چھوٹی بڑی ملا کر چار یا پانچ چوکیاں، وہ بھی بے جوڑ، بوسیدہ، بے مصرف۔ نوکروں میں صرف ایک وفادار، سو بھی کس طرح کہ یہاں سے تو اس کو کھانا تک نہیں ملتا تھا، اور ملے کہاں سے، دیں نہ دیں میاں، سو میاں بے چارے کے پلے ٹکا نہیں۔ دن کو مزدوری کرتا اور رات کو یہاں کی پائنتی آ کر رہتا۔ دنیا کا کوئی کام، یا دین کا روزہ نماز ہو تو صبح و شام کا تفرقہ اور دن رات کا امتیاز ہو۔ مبتلا کو سب وقت یکساں تھے۔ اس کو سونے جاگنے کھانے پینے کسی بات کا کوئی وقت ہی مقرر نہ تھا۔ جب دیکھو منہ اوندھائے چارپائی پر پڑا ہے۔ معلوم نہیں سوتا ہے یا جاگتا ہے۔ اپنی تباہی کا خیال ہے کہ کسی وقت دل سے نہیں جاتا۔ جاگتا ہے تو اس کا سوچ ہے اور سوتا ہے تو اسی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ کبھی اپنے پچھلے وقتوں کو یاد کرتا اور اس کے چہرے پر ایک طرح کی بشاشت آ جاتی۔ تھوڑی دیر بعد خود بخود یکایک چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور پھر اس کے منہ پر مردنی سی چھا جاتی۔ عزت بیگم اور اس کے علاقہ داروں سے، یہاں تک کہ اپنے بچوں سے تو اس کو مطلق ناامیدی تھی۔ وہ خوب سمجھ چکا تھا کہ اب کسی حالت میں جیتے جی ان لوگوں سے صفائی کا ہونا ممکن نہیں۔ رہ گیا قطع تعلق، اس کے لیے چاہیے بہت جرأت، اور یہی باتیں نہ مبتلا میں ہوتیں تو یہاں تک نوبت ہی کیوں پہنچتی۔ قاعدہ ہے کہ جس پر پڑتی ہے اسی کی طبیعت خوب لڑتی ہے۔ رنجوں سے بچنے کا کون سا پہلو تھا جو مبتلا نے نہیں سوچا، مگر جدھر جاتا تھا راہ نجات کو مسدود پاتا تھا۔ مارے غم کے وہ اس قدر نحیف و ناتوان ہو گیا تھا جیسے کوئی برسوں کا بیمار۔ شاید چھینکنے سے اس کو غش آتا اور کھانسی کے ساتھ اس کا سانس رک رک جاتا۔ اللہ رے عزت بیگم! عورت ذات ہو کر اس قدر سخت دلی اور اس بلا کا غصہ کہ مبتلا گھلتے گھلتے چارپائی سے لگ گیا اور اس نے بھول کر بھی خبر نہیں لی۔ ہریالی تھی تو روز والی پرسش رکھاوا، ظاہرداری، جو چاہو سمجھو، بیسیوں بار تو اپنی ماما کو بھیجا اور آخر خود گئی، ہر چند منت خوشامد کی، مگر مبتلا تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے بیٹھا تھا، دوا نہ پیا یا۔ مبتلا خوب سمجھتا تھا کہ میں اس رنج سے جان بر نہیں ہو سکتا۔ اختلاج قلب تو اس کو برسوں سے تھا، اب کسی کسی وقت میں ایک طرح کا ہلکا ہلکا درد بھی اٹھنے لگا۔ تدبیر کچھ ہوئی نہیں، دورے متواتر اور شدید ہونے لگے۔ آخر ایک دن ادھر آفتاب ڈوبتا تھا، ادھر یہ بے کس، بے نصیب، دل کے درد سے کھری چارپائی پر بے تکیہ بے بچھونا تڑپ تڑپ کر سرد ہو گیا۔

انتقال مولوی نذیر احمد کی ساری زندگی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بسر ہوئی۔ انہیں علم حاصل کرنے اور دوسری زبانیں سیکھنے کا شوق زندگی کے آخری لمحوں تک رہا۔ چنانچہ آخری عمر میں انہوں نے ایک ہندو پنڈت سے سنسکرت زبان سیکھنی شروع کر رکھی تھی لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ۲۷، اپریل ۱۹۱۲ء کی رات ان پر فالج کا حملہ ہوا اور دوسرے روز وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انہیں قبرستان باقی باللہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

---

[1] یہ مثل گھوڑے کے حق میں کہی جاتی ہے کہ پیٹھے پہ ہاتھ تو دھرنے ہی نہیں دیتا نعل کیونکر لگائے جائیں۔

[2] مذکر و مونث دونوں طرح جائز ہے۔ اہل دہلی مذکر بولتے ہیں۔

اُردو نثر کی داستان

روشن کتابوں کے سلسلے کی ایک روشن کڑی — جس کی اس سے پہلے بارہ اقساط شائع ہو چکی ہیں —!

کیا آپ کا سیٹ مکمل ہے؟ اگر نہیں تو ہم سے طلب فرمائیں!

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک، انارکلی، لاہور